الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ
آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے

ستمبر ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۸

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیادِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچّا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۸ ستمبر ۱۹۸۶

فہرست

رسول اللہ کا کردار	صفحہ ۲	مرد اور عورت کا فرق	صفحہ ۱۱
جھوٹی بڑائی	۶	قیمت میں اضافہ	۱۴
سب کا فائدہ	۷	فطرت کا فیصلہ	۱۵
بڑا کام کرنے والے	۸	شبلی اور علی گڑھ	۳۲
ٹوٹنے کے بعد	۹	تعمیر ملّت	۴۷
قومی روایات	۱۰	ایجنسی الرسالہ	۴۸

رسول اللہؐ کا کردار

طائف کی وہ شام بھی کس قدر بھیانک تھی جب شہر کے لڑکے پیغمبر اسلام کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر لے جا رہے تھے۔ آپ مکہ سے پچاس میل کا سفر طے کر کے حجاز کے رئیسوں کے گرمائی صدر مقام پہنچے تھے تاکہ انھیں دین اسلام کی دعوت دیں۔ مگر طائف کے رئیسوں نے آپ کے خیر خواہانہ پیغام کو سننے کے بجائے شہر کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لڑکے اس وقت تک آپ کا پیچھا کرتے رہے جب تک سورج نے غروب ہو کر آپ کے اور ان لڑکوں کے درمیان تاریکی کا پردہ نہ ڈال دیا۔

آپ کا جسم زخموں سے چور تھا۔ سر سے پیر تک آپ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے تھک کر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔

غور کیجئے یہ کسی آدمی کے لئے کتنا نازک وقت ہوتا ہے۔ آپ نے خود ایک بار حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ طائف کی یہ شام میری زندگی کی سخت ترین شام تھی۔ مگر آپ کی زبان سے اس انتہائی سنگین موقع پر بھی اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ بلکہ آپ نے فرمایا ــــ "خدایا انھیں صحیح راستہ دکھا۔ کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

رسول اللہؐ کا یہی اخلاق تھا جس نے آپ کے دشمنوں کو اس طرح زیر کیا کہ سارے عرب نے آپ کے پیغام کو قبول کر لیا۔ آپ کے اعلیٰ کردار کے آگے کوئی تعصب، کوئی دشمنی اور کوئی ہٹ دھرمی ٹھہر نہ سکی۔ آپ کی بلند سیرت لوگوں کو جادو کی طرح مسخر کرتی چلی گئی۔

آپ نے ایک بار فرمایا "صلۂ رحمی یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔ بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو (بخاری۔ کتاب الادب) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار اسلام کے کچھ دشمنوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ پر زنا کی تہمت لگائی جو قطعاً جھوٹ اور بے بنیاد تھی۔ اس فرضی داستان کو گھڑنے اور اس کو پھیلانے میں ایک شخص مسطح نامی بھی شریک تھا جو حضرت ابوبکرؓ کا رشتہ دار تھا۔ اس شخص کو ضرورت مند سمجھ کر حضرت ابوبکر اس کو کچھ ماہانہ رقم دیا کرتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر کو معلوم ہوا کہ ان کی صاحبزادی پر جھوٹی تہمت لگانے میں مسطح بھی شریک رہا ہے، تو آپ نے اس کی امدادی رقم بند کر دی۔ اس پر اللہ کے رسول کے اوپر یہ آیت اتری کہ اگر کوئی شخص معاشی حیثیت سے ضرورت مند ہے تو اس کے اخلاقی جرم

کی وجہ سے اس کی مالی امداد بند نہ کرو۔ بلکہ اس کے جرم سے درگذر کرتے ہوئے اس کی معاشی امداد جاری رکھو۔

اسی طرح حضرت ابوبکر ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کو گالی دی۔ حضرت ابوبکر پہلی بار گالی سن کر چپ رہے دوسری بار اس نے گالی دی تو اس وقت بھی آپ چپ رہے۔ مگر اس نے جب تیسری بار بدزبانی کی تو آپ خاموش نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہؐ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا۔ یارسول اللہ کیا آپ مجھ سے خفا ہو گئے۔ فرمایا" ابوبکر جب تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا۔ جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا"۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الانتصار)۔

گویا برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا اس کی طرف سے انتقام لینے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ مگر جب آدمی خود انتقام لینے پر اتر آئے تو خدا اس کے معاملہ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان خدا سے بہتر انتقام نہیں لے سکتا۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم سے کچھ اشرفیاں قرض لیں۔ اس کے بعد ایک روز وہ تقاضے کے لئے پہنچا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس تمہارا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ یہودی نے جواب دیا" جب تک تو میرا قرض ادا نہ کرے گا میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا"۔ چنانچہ ظہر کے وقت سے لے کر وہ اگلی صبح تک آپ کا دھرنا دیے بیٹھا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ میں آپ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے اس کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا مگر آپ نے سب کو منع کر دیا۔ لوگوں نے کہا" حضور ایک یہودی آپ کو قید کئے ہوئے ہے"۔ آپ نے فرمایا کہ" ہاں۔ مگر مجھے ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے"۔ جب دوسرا دن شروع ہوا تو یہودی کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کے اس عمل سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔ یہ یہودی مدینہ کا ایک بہت مالدار شخص تھا۔ کل تک اس نے چند اشرفیوں کے لئے آپ کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اور اب آپ کے اعلیٰ کردار سے اتنا متاثر ہوا کہ ساری دولت آپ کے سامنے حاضر کر دی اور کہا کہ اس کو آپ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ (بیہقی)

عبداللہ ابن ابی الحمساء بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار میں نے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا۔ ابھی معاملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ مجھے کچھ ضرورت پیش آ گئی۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھہریئے۔ میں گھر سے واپس آتا ہوں تو بقیہ معاملہ کو مکمل کرتا ہوں۔ مگر واپس آنے کے بعد میں ایسا

مشغول ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین روز بعد مجھ کو اپنا وعدہ یاد آیا تو میں اس مقام پر پہنچا، دیکھا کہ وہاں رسول اللہ موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا "تم نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ میں تین روز سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" (ابوداؤد)

اس طرح کے عمل میں اتنی کشش ہے کہ کٹر سے کٹر آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا السام علیکم (تباہی ہو تم پر) حضرت عائشہؓ سے نہیں رہا گیا۔ انھوں نے کہا "بلکہ تم لوگ غارت ہو جاؤ اور تم پر خدا کی لعنت ہو۔" آپ نے سنا تو منع فرمایا۔ آپ نے کہا "خدا مہربان ہے اور وہ ہر کام میں مہربانی کو پسند کرتا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ دشمن کا دل جیتنے کے لئے اس سے بڑا کوئی حربہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی بدزبانی کا جواب نرم باتوں سے دیا جائے۔ ہتھیار کے حملے کی تاب لانا تو ممکن ہے مگر کردار کے حملے کے مقابلے میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہاں ہر شخص کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر تین شرطوں کے ساتھ قریش سے معاہدہ کیا تھا جن میں سے ایک شرط یہ تھی:

جو غیر مسلم اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے یہاں چلا جائے اس کو وہ واپس کر دیں گے مگر جو مسلمان ہمارے پاس آجائے گا ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔

یہ معاہدہ ہو رہا تھا کہ مکہ سے ایک مسلم نوجوان ابوجندلؓ حدیبیہ پہنچے۔ ان کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں مکہ والوں نے قید کر رکھا تھا اور وہ بیڑیاں پہنے ہوئے گرتے پڑتے اس حال میں یہاں پہنچے تھے کہ ان کا جسم بیڑیوں کی رگڑ سے زخمی ہو رہا تھا۔ وہ فریاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے دشمنوں کے چنگل سے بچائیے۔

یہ بے حد نازک موقع تھا۔ تمام صحابہ کی تلواریں کھنچ گئیں۔ ابوجندل کے جذباتی واقعہ کے بعد ہر شخص کا رجحان یہ ہو گیا کہ معاہدہ کو کالعدم کر کے ابوجندل کی زندگی کو بچایا جائے۔ دوسری طرف مکہ والوں نے کہا "محمد! یہ معاہدہ کی تعمیل کا پہلا موقع ہے۔" خدا کے رسول نے فیصلہ کیا کہ جو معاہدہ ہو چکا ہے اب اس سے ہم پھر نہیں سکتے۔ چنانچہ انھیں دوبارہ مکہ والوں کے حوالے کر دیا گیا۔

بظاہر اس واقعہ کے معنی صرف یہ تھے کہ مظلوم کو دوبارہ ظالم کے چنگل میں دے دیا جائے۔ مگر اس واقعہ میں وعدہ پورا کرنے کا جو شاندار مظاہرہ ہوا اس نے ظالموں کو اندر سے پچھاڑ دیا۔ اگرچہ وہ ابوجندل کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں اپنے یہاں قید میں رکھا۔ مگر ایفائے عہد

کی اس بلند ترین علامت کو دیکھ کر مکہ کے لوگ اتنی کثرت سے مسلمان ہونے شروع ہوئے کہ قید و بند کی حالت میں بھی ابوجندل انھیں ایک زبردست خطرہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس میں عافیت سمجھی کہ ان کو رہا کر کے مکہ کے باہر بھیج دیا جائے۔ (صحیحین)

حضرت ابوہریرہؓ مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نجد کے دشمنوں کی طرف چند سوار بھیجے۔ وہ شہر یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں پا گئے اور اسے گرفتار کر لائے۔ اور مدینہ لا کر مسجد کے ایک ستون سے اسے باندھ دیا۔ رسول اللہ اس کے پاس آئے اور حال دریافت کیا۔ ثمامہ نے جواب دیا ــــ "اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو میری قوم تم سے میرے خون کا بدلہ لے گی، اور اگر مجھ پر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو عمر بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ اور اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا مال چاہو میں پیش کرنے کو تیار ہوں۔" رسول اللہؐ نے اس کی رہائی کا حکم دیدیا۔

یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں بہت عجیب تھا۔ کیوں کہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آجانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا مگر اپنے اخلاقی عمل سے اس کی روح کو قتل کر دیا۔ چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد نبوی میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کس لئے دوبارہ یہاں آیا ہے۔ مگر جب اس نے بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے اسے رہا کر کے در اصل ہمیشہ کے لیے گرفتار کر لیا تھا۔

اس کے بعد ثمامہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ گیا جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے کہا "تم بے دین ہو گئے۔" ثمامہ نے جواب دیا "بے دین نہیں ہوا۔ البتہ محمد کے دین کو قبول کر لیا ہے۔"

اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی، ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ انھوں نے مکہ والوں سے کہا کہ سن لو! محمد کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمہارے یہاں نہیں آئے گا۔" (صحیح مسلم)

کردار بظاہر ایک بے قیمت چیز ہے۔ مگر اس کو دے کر آدمی کیسی کیسی قیمتی چیزوں کو خرید لیتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۹ جون ۱۹۶۸ کو نشر کیا گیا۔

جھوٹی بڑائی

ایک صاحب کا قصہ ہے۔ ان کے دادا کامیاب تاجر تھے۔ مگر بعد کو ان کی تجارت ختم ہو گئی۔ والد اور والدہ کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ مذکورہ صاحب کے حصہ میں باپ دادا کا مال تو نہ آیا البتہ یہ احساس انھیں وراثت میں ملا کہ " میرے باپ دادا بڑے آدمی تھے "

وہ ابھی نوجوان تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ قصبہ کے ڈاک خانہ میں پوسٹ مین کی جگہ خالی ہے۔ وہ درخواست دے کر پوسٹ مین ہو گیے۔ لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ تمہاری تعلیم صرف آٹھویں کلاس تک ہوئی ہے، تم کوشش کر کے ہائی اسکول کر ڈالو۔ اس کے بعد تم آسانی سے مقامی ڈاک خانہ میں پوسٹ ماسٹر ہو جاؤ گے۔ اسی کے ساتھ کچھ گھر کی کھیتی ہے۔ دونوں کو ملا کر آسانی سے تمہاری ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ مگر ان کے جھوٹے فخر کی نفسیات اس میں رکاوٹ بن گئی کہ وہ کسی کا مشورہ مانیں۔ مزید یہ ہوا کہ جھوٹی بڑائی کے احساس کی بنا پر اکثر وہ ڈاک خانہ کے کارکنوں سے لڑ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز انھوں نے پوسٹ ماسٹر سے جھگڑا کر لیا اور کام چھوڑ کر چلے آئے۔

پوسٹ آفس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ بے کار پڑے رہے۔ نہ کوئی دوسرا کام کیا اور نہ تعلیم حاصل کی۔ ان کا مشغلہ صرف یہ رہ گیا کہ اپنی فرضی بڑائی کے تذکرے کریں اور اس کے ذریعہ جھوٹی تسکین حاصل کرتے رہیں۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد کھیتی سے کام چلتا رہا جس کو وہ بٹائی پر دیئے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے چھ بچے ہو گیے۔ اب مسائل نے پریشان کرنا شروع کیا۔ تاہم ان کی جھوٹی بڑائی کا احساس دوبارہ اس میں رکاوٹ بنا رہا کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے لڑنے لگے۔ مگر اس غیر حقیقت پسندانہ رویہ نے صرف ان کی بربادی میں اضافہ کیا یہاں تک کہ ان کا ذہنی توازن خراب ہو گیا۔

موجودہ دنیا حقیقتوں کی دنیا ہے۔ یہاں حقیقت سے مطابقت کر کے آپ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر آپ حقیقت سے مطابقت نہ کریں تو آپ کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ خدا کی اس دنیا میں جھوٹی بڑائی سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔ یہاں جھوٹی بڑائی سے زیادہ تباہ کن کوئی ذہنیت نہیں۔

سب کا فائدہ

ایک لطیفہ ہے کہ شہنشاہ اکبر نے ایک روز اپنے خاص درباری بیربل سے کہا : بیربل، اگر ایک بادشاہ کی بادشاہت ہمیشہ رہتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ بیربل نے جواب دیا : عالی جاہ ، آپ نے بجا فرمایا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو آج آپ بادشاہ کیوں کر ہوتے۔

اکبر نے بادشاہت کو اپنی ذات سے شروع کیا۔ اس نے سوچا کہ اگر دنیا میں یہ اصول رائج ہو کہ ایک بادشاہ ہمیشہ باقی رہے تو میں ہمیشہ اسی طرح بادشاہ بنا رہوں گا۔ اکبر بھول گیا کہ بادشاہت کا سلسلہ تو دنیا میں اس وقت سے ہے جب کہ وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اگر اکبر کا پسندیدہ اصول دنیا میں رائج ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ اکبر بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات کو سامنے رکھ کر سوچتا ہے۔ وہ صرف ذاتی مفاد کے تحت اپنے گرد ایک نقشہ بنا لیتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس دنیا میں وہ اکیلا نہیں ہے۔ چنانچہ بہت جلد خارجی حقیقتیں اس سے ٹکراتی ہیں اور اس کے نقشہ کو توڑ ڈالتی ہیں۔ اس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذاتی مفاد بھی اسی میں تھا کہ وہ مجموعی مفاد کا لحاظ کرتا۔

اگر آپ اپنی ذات کا فائدہ چاہتے ہوں تب بھی آپ کو سب کا فائدہ چاہنا چاہیے۔ سب کے فائدے میں آپ کا اپنا فائدہ بھی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی ایک اجتماعی کشتی میں سوار ہے۔ کشتی کے بچاؤ میں اس کی اپنی ذات کا بچاؤ بھی اپنے آپ شامل ہے۔

جن لوگوں کو اس دنیا میں کچھ مواقع ملتے ہیں وہ اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی ذات کے لحاظ سے اصول اور قاعدے بنانے لگتے ہیں۔ وہ جس طریقے میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اس کو رائج کرنے لگتے ہیں مگر یہ طریقہ اکثر الٹا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں کوئی شخص ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ مواقع کبھی ایک شخص کے ہاتھ میں آتے ہیں اور کبھی وہ دوسرے کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں محض اپنی ذات کو سامنے رکھ کر قواعد بنانا عقل مندی نہیں۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ حالات بدلیں اور جو چیز پہلے آپ کو اپنے موافق نظر آتی تھی وہ بعد کو آپ کے مخالف بن جائے۔ اپنی ذات کو مرکز بنا کر سوچنا باعتبار حقیقت نہ اپنی ذات کے لیے مفید ہے اور نہ بقیہ انسانیت کے لیے۔

بڑا کام کرنے والے

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ انسان جس کا حال یہ ہو کہ وہ جو کچھ کرے اس کی قیمت مع اضافہ کے وصول کرنا چاہے۔ دوسرا انسان وہ ہے کہ وہ جو کچھ کرے اسے بھول جائے۔ اسے اپنے کیے کا کوئی معاوضہ نہ ملے تب بھی وہ کوئی شکایت اپنے دل میں نہ لائے۔ اس کی تسکین کا سامان یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مقصد میں لگائے ہوئے ہے نہ یہ کہ اس کو اس کے عمل کا فوری معاوضہ مل رہا ہے۔

پہلی قسم کے لوگ بھی انسان ہیں اور دوسری قسم کے لوگ بھی انسان۔ مگر دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ظاہری صورت کے سوا دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ پہلی قسم کے لوگ صرف بازار چلاتے ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کے لوگ تاریخ بناتے ہیں۔

یہی دوسری قسم کے لوگ انسانیت کا اصل سرمایہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے ہمیشہ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ مل کر کام کریں۔ جب اس طرح لوگ ملتے ہیں تو کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کوئی کریڈٹ پاتا ہے اور کوئی بے کریڈٹ رہ جاتا ہے۔ کسی کا استقبال ہوتا ہے اور کوئی دیکھتا ہے کہ وہ نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال بالکل فطری ہے۔ یہ فرق ہمیشہ پیش آتا ہے۔ خواہ وہ کوئی عام تحریک ہو۔ یا کسی پیغمبر کی تحریک ہو۔ ایسی حالت میں متحدہ کوشش کو باقی رکھنے کی واحد قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے حقوق کو بھول جائیں اور صرف اپنی ذمہ داری کو یاد رکھیں۔

اس مزاج کی ضرورت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اجتماعی جد وجہد میں کچھ لوگ بے معاوضہ رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اس لیے بھی ہے کہ ملنے والا معاوضہ اکثر آدمی کے اپنے اندازہ سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ معاوضہ ملنے پر بھی وہی تمام شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ سرے سے کوئی معاوضہ نہ ملا ہو۔

بڑا کام کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کا حال یہ ہو کہ ان کا عمل ہی ان کا معاوضہ بن جائے۔ اپنی ذمہ داری کو بھرپور طور پر ادا کر کے ان کو وہ خوشی حاصل ہو جو کسی شخص کو اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے کام کے نتیجہ میں اس کو کوئی بہت بڑا انعام حاصل ہو جائے۔

ٹوٹنے کے بعد

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ اس کا ٹوٹنا ہمیشہ کے لیے ٹوٹنا بن جائے گا۔ لکڑی اپنے وجود کو دوبارہ پہلے کی طرح ایک نہیں بنا سکتی۔ مگر زندہ چیزوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ زندہ چیز ٹوٹنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ ایک زندہ ایمبا جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ ایمبا بن جاتا ہے۔

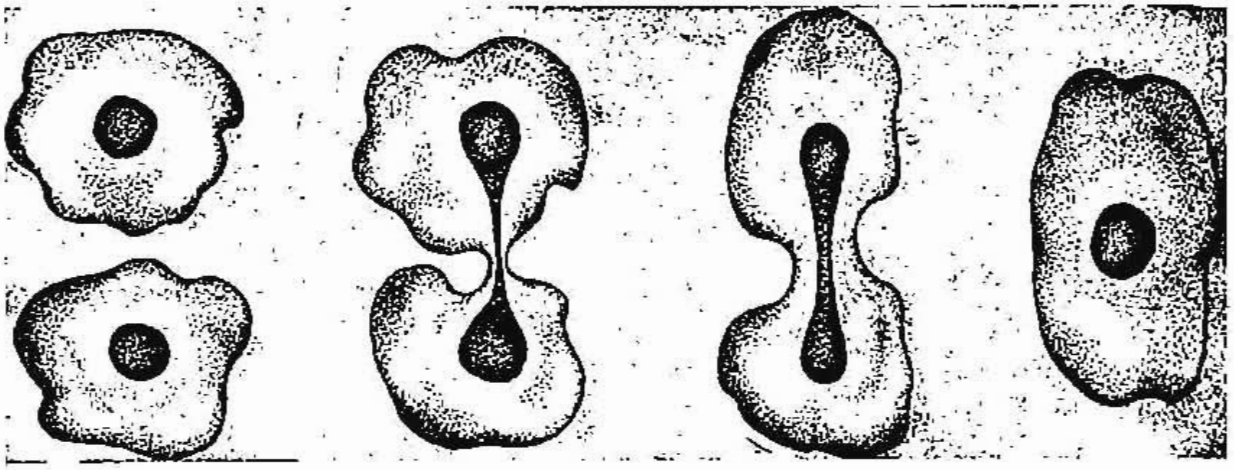

ہماری دنیا میں اس طرح کے واقعات خدا کی عظیم نشانی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک زندہ انسان کے لیے خدا نے اس دنیا میں کتنا بڑا امکان چھپا رکھا ہے۔ یہ امکان کہ اس کی کوئی بھی شکست آخری شکست نہ بنے۔ کوئی بھی حادثہ اس کو آخری طور پر ختم نہ کرنے پائے۔ ایک زندہ چیز یا ایک زندہ انسان کو کبھی توڑا نہیں جا سکتا۔ زندہ چیز اگر ٹوٹتی ہے تو اس کا ہر حصہ ایک نئے زندہ وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور نتیجۃً پہلے سے بھی زیادہ عظیم بن جاتا ہے۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ ناکامی اس کو فکری گہرائی عطا کرتی ہے۔ رکاوٹیں اس کے ذہن کے بند دروازے کو کھولتی ہیں۔ حالات اگر اس کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو اس کا ہر ٹکڑا دوبارہ نئی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔

اس امکان نے اس دنیا میں کسی انسان کو ابدی طور پر ناقابل تسخیر بنا دیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ زندہ ہو، وہ ٹوٹنے کے بعد دوبارہ اپنی قوتوں کو متحد کرنا جانتا ہو۔ بازی کھونے کے بعد وہ اپنا حوصلہ نہ کھوئے۔ ایک کشتی ٹوٹنے کے بعد وہ دوبارہ نئی کشتی کے ذریعہ اپنا سفر شروع کر سکے۔

قومی روایات

مسٹر سرجیت سنگھ برنالہ پنجاب کے چیف منسٹر ہیں۔ ان کے حکم سے ۳۰ اپریل ۱۹۸۶ کو مسلح پولیس امرتسر کے گردوارہ میں داخل ہوئی تاکہ وہاں سے دہشت پسندوں کو نکالے۔ یہ واقعہ سکھ روایات کے خلاف تھا۔ اس سے گردوارہ کا تقدس مجروح ہوا۔ چنانچہ اکال تخت نے مسٹر برنالا کو ۷ امئی ۱۹۸۶ کو اپنے یہاں بلایا اور ان کے کفارے کے لیے چند سزاؤں کا اعلان کیا۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ مسٹر برنالا کسی گردوارہ میں ایک ہفتہ تک لوگوں کے جوتے صاف کریں۔ مسٹر برنالا نے اس فیصلے کو قبول کرلیا اور اکال تخت کے فیصلہ کے مطابق ایک ہفتہ تک گردوارہ کے جوتے صاف کرتے رہے۔ اس واقعہ پر اخباروں میں سخت تبصرے کیے گئے۔ ٹائمس آف انڈیا نے لکھا کہ برنالا اپنے آپ کو بے عزت کررہے ہیں :

Barnala humiliates himself. (May 19, 1986)

اس سلسلہ میں مسٹر برنالا کی ایک گفتگو اخبارات میں آئی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے :

> The Chief Minister said he accepted the verdict of the Akal Takht in all humility as a devout Sikh for the glory of the Panth and to maintain the highest Sikh traditions.

چیف منسٹر نے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اکال تخت کے فیصلہ کو ایک سچے سکھ کی طرح پوری انکساری کے ساتھ پنتھ کی عظمت کے لیے قبول کیا ہے۔ اور اس لیے تاکہ اعلیٰ سکھ روایات برقرار رہ سکیں۔

قومی زندگی ہمیشہ روایات پر چلتی ہے۔ یہ روایتیں قوم کے بڑے لوگ بناتے ہیں اور وہی اس کو توڑتے بھی ہیں۔ اعلیٰ روایات کے بغیر کوئی قوم اعلیٰ ترقی نہیں کرسکتی۔ وہ قوم خوش قسمت ہے جس کے بڑے لوگ اعلیٰ روایات کو باقی رکھنے والے ہوں خواہ اس کی خاطر انھیں اپنی ذات کو نیچے گرادینا پڑے۔ اس کے برعکس وہ قوم بدقسمت ہے جس کے بڑے لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اپنی قومی اور اخلاقی روایات کو توڑ ڈالیں۔ وہ اپنی ذات کو اونچا رکھنے کے لیے اپنی قوم کو نیچا کریں۔

مرد اور عورت کا فرق

انگریز مستشرق ایڈورڈ ولیم لین (۱۸۷۶ - ۱۸۰۱) نے قرآن کے منتخب حصوں کا انگریزی ترجمہ تیار کیا تھا۔ یہ ترجمہ پہلی بار لندن سے ۱۸۴۳ میں چھپا۔ اس ترجمہ کے ساتھ ایک دیباچہ شامل تھا۔ اس دیباچہ میں فاضل مترجم نے اسلامی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کا تباہ کن پہلو عورت کو حقیر درجہ دینا ہے :

The fatal point in Islam is the degradation of women.
Edward William Lane,
Selections from Kuran,
London 1982, p. XC (Introduction)

یہ بات اتنی عام ہوئی کہ ہر شخص بے تکلف اس کو دہرانے لگا۔ اس بیان پر اب تقریباً ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں مگر ابھی تک لوگوں کے یقین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہندستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر چندرا چوڑ نے محمد احمد - شاہ بانو کیس میں ۱۹۸۵ میں جو فیصلہ دیا ہے اس میں بھی اس بیان کو اس طرح بے تکلف دہرایا گیا ہے جیسے کہ وہ کوئی مسلّمہ حقیقت ہو۔

عورت کے بارہ میں اسلام کے نقطہ نظر کو تنزیل رتبہ (Degradation) سے تعبیر کرنا اصل بات کو بگاڑ کر پیش کرنا ہے۔ عورت کے بارہ میں اسلام کا کہنا یہ نہیں ہے کہ وہ مرد سے کم ہے۔ اسلام کا کہنا صرف یہ ہے کہ عورت مرد سے مختلف ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں فرق کا معاملہ ہے نہ کہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کے بہتر ہونے کا :

Not better, but different.

ایک ڈاکٹر اپنے مریض سے کہتا ہے کہ ــــــ "آنکھ تمہارے جسم کا نہایت نازک حصہ ہے تم اپنی آنکھ کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کر سکتے جو، مثال کے طور پر، تم اپنے ناخن کے ساتھ کرتے ہو۔ اپنی آنکھ کے معاملہ میں تم کو زیادہ محتاط رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔" ڈاکٹر کی اس ہدایت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ناخن کے مقابلہ میں آنکھ کو کم تر درجہ دے رہا ہے۔ بلکہ وہ ناخن کے مقابلہ میں آنکھ کے فرق کو بتا رہا ہے۔

عورت اور مرد کے بارہ میں اسلام میں جو قوانین ہیں وہ سب اسی اصولی حقیقت پر مبنی ہیں کہ عورت اور مرد دو الگ الگ صنفیں ہیں۔ تخلیقی اعتبار سے دونوں کے اندر قطعی فرق پائے جاتے ہیں۔ اس لیے خاندانی اور سماجی زندگی میں دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہو سکتا۔ جب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی بناوٹ کے اعتبار سے فرق ہے تو ان کے درمیان عمل کے اعتبار سے بھی لازماً فرق ہونا چاہیے۔

عورت کے بارہ میں یہی تمام آسمانی مذاہب کا نقطہ نظر رہا ہے۔ پچھلی ہزاروں برس کی تاریخ میں کبھی اس پر شبہ نہیں کیا گیا۔ دور جدید میں آزادی نسواں کی تحریک (Women's Liberation Movement) نے پہلی بار دنیا میں یہ ذہن پیدا کیا کہ عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں اور دونوں کو ہر میدان میں بالکل یکساں کام کے مواقع ملنے چاہئیں۔

یہ تحریک سب سے پہلے برطانیہ میں اٹھارھویں صدی میں اٹھی۔ اور اس کے بعد پورے یورپ اور امریکہ میں پھیل گئی۔ میری وولسٹون کرافٹ (Mary Wollstonecraft) نے ۱۷۹۲ میں ایک کتاب چھاپی جس کا نام تھا:

A Vindication of the Rights of Women

اس کتاب کا خلاصہ یہ تھا:

> Women should receive the same treatment as men in education, work opportunities, and politics and that the same moral standards should be applied to both sexes (X/733).

تعلیم، روزگار اور سیاست کے میدان میں عورتوں کو وہی مواقع ملنے چاہئیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ ایک ہی اخلاقی معیار ہونا چاہیے جو دونوں صنفوں پر منطبق کیا جائے۔

اس بات کو اتنے زور و شور کے ساتھ اٹھایا گیا کہ ہر طرف اس کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ مرد اور عورت دونوں اس میں یکساں طور پر شریک تھے۔ حتی کہ عورت اور مرد کے درمیان نابرابری کی بات کرنا پس ماندگی کی علامت قرار پایا۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ فکر ساری دنیا میں چھا چکا تھا۔ اب اسی کے مطابق قوانین بنائے گیے۔ اسی کے مطابق ہر شعبہ مردوں کی طرح عورتوں کے لیے کھول دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

مگر عملاً یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ تقریباً دو سو سالہ جدوجہد کے بعد بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ عورت آج بھی تمام شعبہ حیات میں اسی طرح پیچھے ہے جس طرح وہ آزادی نسواں کی تحریک سے پہلے پیچھے تھی۔ اس تحریک کا عملی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ عورت گھر سے باہر آگئی۔ وہ ہر جگہ مردوں کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ عورت نے اپنی نسوانیت کھو دی مگر اس کی قیمت میں اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کے لیے اس نے اپنی نسوانیت کھوئی تھی ـــــ یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے برابر مقام۔

آزادی نسواں کی تحریک کی اس مکمل ناکامی نے دوبارہ لوگوں کو اس مسئلہ کی تحقیق پر آمادہ کیا۔ ساری دنیا میں خالص سائنسی انداز میں اس کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ آخر کار یہ ثابت ہوا کہ عورت اور مرد کے درمیان تخلیقی فرق ہے۔ یہی تخلیقی فرق وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر عورت کو زندگی کے شعبوں میں مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا ـــــ عورت کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر کو جھوٹے فلسفوں نے مشتبہ بتایا تھا، سائنس کے حقائق نے دوبارہ اس کو ثابت شدہ بنا دیا۔

اب سوال یہ ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ عورت اور مرد کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر ہی صحیح نقطۂ نظر ہے، اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ آج بھی لوگ اسی پرانی بات کو دہراتے ہیں۔ آج بھی اسلام پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اس نے عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔

ہندستان میں حکومت کے خرچ پر یہ اسکیم شروع کی گئی ہے کہ مجاہدین آزادی (Freedom fighters) کی آوازوں کو ریکارڈ کر لیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ان کے خیالات کو ان کی اپنی آواز میں سن سکیں۔ اس سلسلہ میں مسٹر ایس ایم جوشی کے انٹرویو کا خلاصہ اخبارات میں آیا ہے۔ جن کی عمر ریکارڈنگ کے وقت ۸۲ سال ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک اخبار (ٹائمس آف انڈیا ۶ اپریل ۱۹۸۶) کے الفاظ میں یہ تھی:

> The Shariat of the Muslims and the Manusmruti of the Hindus — followed by both the communities for centuries — were equally and socially reactionary.

مسلمانوں کی شریعت اور ہندوؤں کی منوسمرتی جس کو دونوں فرقے صدیوں سے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یکساں طور پر اور سماجی طور پر رجعت پسند ہیں۔

اس طرح کی باتیں جو آج بھی بڑے پیمانہ پر کہی جارہی ہیں، اس پر جھنجھلانے کے بجائے ہمیں اس کے سبب پر غور کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کے فرق کے بارہ میں جدید نظریہ ابھی تک صرف علمی تحقیق ہے، وہ ابھی تک فکری انقلاب نہ بن سکا۔ اس دنیا کا قاعدہ ہے کہ کوئی نقطۂ نظر خواہ وہ کتنا ہی مدلل ہو، وہ لوگوں کے درمیان اس وقت تک عمومی قبولیت حاصل نہیں کرتا جب تک اس کو فکری انقلاب کا درجہ نہ دے دیا جائے۔

پچھلے زمانہ میں جو انبیاء آئے، ان میں سے ہر نبی توحید کو دلائل کے اعتبار سے ثابت شدہ بناتا رہا۔ اس کے باوجود یہ ممکن نہیں ہوا کہ شرک کا خاتمہ ہو اور توحید کو عمومی غلبہ حاصل ہو جائے۔ یہ دوسرا کام صرف اس وقت ہوا جب کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب اٹھے اور اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعہ توحید کی حقانیت کو فکری انقلاب کے درجہ تک پہونچا دیا۔

اسی طرح موجودہ زمانہ میں بھی ایک فکری انقلاب درکار ہے۔ علم جدید نے اس کے حق میں استدلالی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ اہل دین اس مہم کو آگے بڑھائیں اور اس کے حق میں ضروری جدوجہد کرکے اس کو عالمی فکری انقلاب کے درجہ تک پہونچا دیں۔ اگلی سطروں کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو اس تاریخی جدوجہد کے لیے اٹھنے پر آمادہ کیا جاسکے۔

قیمت میں اضافہ

تمام چیزوں میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے الرسالہ کے اخراجات ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیے ہیں۔ چنانچہ یہ تجویز ہے کہ الرسالہ کی قیمت میں اضافہ کرکے فی شمارہ چار روپیہ اور سالانہ ۴۸ روپے کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں آخری اعلان آئندہ کیا جائے گا۔

فطرت کا فیصلہ

مغربی تہذیب کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ مرد اور عورت کی مساوات تھا۔ مغربی دنیا میں پچھلے سو سال سے اس نظریہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ کسی بھی شعبہ میں یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ قانون کے اعتبار سے برابر کا درجہ پانے کے باوجود عملی طور پر دونوں سماج کے اندر برابر کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

اس فرق کے بارہ میں ابتدائی یہ کہا گیا کہ یہ فرق ماحول (Environment) کا پیدا کردہ ہے۔ مگر جدید تحقیقات اس مفروضہ کو سراسر بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مختلف شعبوں میں تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ فرق حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام تر پیدائشی ہے نہ کہ تاریخی۔

نیو یارک کے نیوز ویک (۱۸ مئی ۱۹۸۱) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں مختلف امریکی محققین کے نتائج تحقیق درج ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عورت اور مرد کی بناوٹ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرد کا مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہونا، عورتوں کا جذباتی طور پر سوچنا، لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ بہادرانہ انداز سے کھیلنا، ریاضیات میں مردوں کا زیادہ برتر رہنا، یہ سب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے نہ کہ محض ماحول کا۔

محققین کا خیال ہے کہ قائدانہ خصوصیتیں (Leadership capacities) مردوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید تحقیقات لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لے جا رہی ہیں کہ سابقہ خیال کے برعکس پرورش (Nurture) نہیں بلکہ فطرت (Nature) وہ اصل عامل ہے جس نے مرد اور عورت کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔ عمومی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ دونوں کے ہارمون (Harmone) جدا جدا ہوتے ہیں اور وہی دونوں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ محققین نے نر کے ہارمون Harmone testosterone کو مادہ کے جسم میں داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں میں پیدائش سے پہلے مردانہ ہارمون داخل کر دیئے گئے۔ چنانچہ پایا گیا کہ پیدائش کے بعد ان میں گڑیوں سے کھیلنے کا شوق بہت کم تھا، ان میں لڑکوں کی طرح جارحیت کا مزاج زیادہ پایا گیا۔

محققین نے پایا ہے کہ ہارمون خود دماغ کے ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں۔ نر اور مادہ کے دماغ (Brain) میں فرق پایا گیا ہے اور اس کا سبب دونوں کے ہارمون کا فرق ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ دونوں صنفوں کے درمیان ناقابل انکار فرق (Undeniable difference) موجود ہے۔

یہ تحقیقات واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں فرق ہے اور جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہونا چاہیے۔ مگر جو لوگ لمبی مدت تک پچھلے خیال کے ساتھ وابستہ رہے ہیں وہ ابھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ایک مغربی عالم نے کہا:

> Whether these physiological differences destine men and women for separate roles in society is another and far more delicate question.

کیا یہ عضویاتی فرق مردوں اور عورتوں کے لئے سماج کے اندر الگ الگ کردار مقرر کرتے ہیں، یہ ایک علیحدہ اور زیادہ پیچیدہ سوال ہے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس سے پہلے امریکہ کے ایک اور ہفتہ وار میگزین ٹائم (۲۰ مارچ ۱۹۷۲) نے اس موضوع پر تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف میں سے ۲۰ تعلیم یافتہ خواتین کو مقرر کیا گیا کہ وہ "جدید امریکہ میں عورتوں کی حالت" کا جائزہ لیں۔ انھوں نے ہر میدان میں اس کا جائزہ لیا اور ہر شعبہ کے ماہرین سے مدد لی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو خصوصی نمبر کے طور پر مذکورہ میگزین میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف نے اس رپورٹ کا ایک خلاصہ اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی (۱۷ نومبر ۱۹۷۲) میں شائع کیا تھا۔

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سو سالہ جد وجہد کے باوجود امریکی عورت ابھی تک اسی مقام پر ہے جہاں وہ سو سال پہلے تھی۔ مرد ابھی تک جدید امریکہ میں جنس غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ قدیم نظریہ کے مطابق، سماجی نہیں ہے بلکہ تمام تر حیاتیاتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب میں آزادی نسواں کی تحریک سو سالہ تجربہ کے بعد اب اس رائے پر پہنچی ہے کہ حیاتیاتی حقائق عورت کو مرد کے برابر مقام دینے میں رکاوٹ ہیں۔ یہ قدرت کا ظلم ہے نہ کہ سماج کا ظلم۔ اس لئے اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس آف ایوجنیکس کے ذریعہ رحم مادر میں جینٹک کوڈ کو بدل دیا جائے اور اس طرح نیا حیاتیاتی نظام وجود میں لایا جائے جس میں نئے قسم کی عورتیں پیدا ہوں اور مردوں کی برتری ختم ہو کر یکساں صنفی صلاحیت کا سماج بن سکے ——— یہ تجویز ایسی ہی ہے جیسے کوئی

شخص بطور خود یہ نظریہ قائم کرلے کہ مچھلی اور بکری دونوں ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے مچھلی کو بھی دودھ دینا چاہیے جس طرح بکری دودھ دیتی ہے۔ اور جب کوشش کے باوجود مچھلی دودھ نہ دے تو وہ کہے کہ ہم میڈیکل سائنس کے ذریعہ نئی قسم کی مچھلیاں پیدا کریں گے جو بکری کی مانند دودھ دینے لگیں۔

فطرت سے جنگ

کسی ڈاکٹر کو ایک روز خیال آجائے کہ منھ کا مقام چہرہ پر نہیں بلکہ پیٹ پر ہونا چاہیے اور اس کے بعد وہ آپریشن کے ذریعہ منھ کو چہرہ سے ہٹا کر پیٹ پر منتقل کرنا شروع کر دے، تو دنیا اس کی بیوقوفی پر ہنسے گی۔ کیوں کہ فطرت نے کسی چیز کا جو مقام متعین کر دیا ہے وہاں سے اس کو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ہماری کامیابی یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ کر معاملہ کریں۔ نہ کہ خود ساختہ نظریہ کے تحت اشیاء کی ترتیب بدل کر ایک نیا نقشہ بنانے کی مہم شروع کر دیں۔

اسی تخیل پسندی کی ایک مثال عورت کا مسئلہ ہے۔ جدید تہذیب نے زندگی کا نیا نقشہ بنانا شروع کیا تو اس میں اس کا ایک نعرہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات ہونی چاہیے۔ اس خوش نما تخیل کو وجود میں لانے کے لیے خاندان اور معاشرت کا سارا ڈھانچہ الٹ پلٹ دیا گیا۔ مگر آخر میں جو چیز حاصل ہوئی وہ یہ کہ عورت گھر سے باہر تو آگئی، مگر عملی زندگی میں وہ مرد کی ہم سر نہ ہو سکی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہاں فطرت نے انسانی تخیل کا ساتھ نہیں دیا۔

ایک روسی سائنس داں انٹون نملوف جو خواہش کی حد تک خود بھی عورت اور مرد میں کامل مساوات دیکھنا چاہتا ہے، اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ حیاتیات میں ہماری اس خواہش کے لیے بنیاد موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عملاً یہ چیز اب تک حاصل نہ ہو سکی۔

وہ سائنس کے تجربات اور مشاہدات پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام تمدن میں محدود حقوق دیئے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساواتِ مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی، جتنی سوویت روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں

اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گیے ۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے ۔" (صفحہ ۷۶)

" اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنی درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویت طبقوں میں بھی جما ہوا ہے۔ اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی۔ بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنس داں، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر یا کسی صد فیصد کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عورت کو وہ اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ضرور ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی۔ (۹۵-۱۹۴)

عورت کو مساوات کا درجہ نہ ملنا کوئی وقتی اور عملی خرابی نہیں بلکہ اس کی وجہ حیاتیات تک جاتی ہے۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے :

"اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکراتا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے اور دونوں پر یکساں بار نہیں ڈالا گیا ہے ۔" (۷۷)

Anton Nemilov, *The Biological Tragedy of Woman*, London, 1932

فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ چیز عملاً حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یقینی طور پر اس کی وجہ سے کئی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فطرت نے کسی چیز کو جہاں رکھا ہے وہی اس کی اصل جگہ ہے۔ اور جب کسی چیز کو اس کے واقعی مقام سے ہٹایا جائے تو اس کے نتیجہ میں خرابی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

یہی چیز عورت کے معاملہ میں ہوئی۔ عورت کو مرد کے مساوی بنانے کے لیے گھر سے باہر نکالا گیا۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ عورت فی الواقع مرد کے مساوی ہو جاتی۔ البتہ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر مردوں

کے ساتھ کھڑا کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ فواحش کا سیلاب امنڈ آیا۔

مذکورہ بالا مصنف لکھتا ہے :

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت پرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقہ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے" (۳-۱۰۲) روسی مصنف نے یہ بات پچاس سال پہلے کہی تھی۔ مگر بعد کے سالوں نے اس کی مزید تصدیق کی ہے۔ اس کے الفاظ آج مزید اضافہ کے ساتھ جدید معاشرہ کے لیے صحیح ہیں وہ کسی اعتبار سے غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں۔

جدید انسان نے عورت اور مرد کے قدیم تصور کو دقیانوسی قرار دیا۔ اور عورت اور مرد کے درمیان صنفی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ فطرت (Nature) سے جنگ کرنا تھا۔ یہ حقیقتِ واقعہ سے ٹکرانا تھا، اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا مقصد تو حاصل نہیں ہوا۔ البتہ اس مصنوعی کوشش کا یہ نقصان ہوا کہ معاشرہ کے اندر نئی نئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔

چند مثالیں

مغربی تہذیب نے عورت کے معاملہ میں فطرت سے جو انحراف کیا، اس کے بڑے عجیب اور مہلک نتائج پیدا ہوئے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔

شادی نہ کرنا غلطی

گریٹا گاربو (Greta Garbo) کسی زمانہ میں ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹریس تھی۔ مگر اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد فلمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے پرانے دوست بھی سب کے سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ کو اس نے اپنی ۷۵ ویں سال گرہ تنہا منائی۔ گریٹا گاربو کے سوانح نگار نے اس سے

پوچھا کہ کیا آپ کو اس بات پر افسوس ہے کہ آپ نے شادی نہیں کی جس کی وجہ سے آج آپ کی تنہائیوں کا کوئی ساتھی نہیں۔ گریٹا گاربو نے غمگین لہجہ میں جواب دیا: میرا خیال ہے کہ میرا شادی نہ کرنا ایک غلطی تھی (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۰)

(Not getting married was a mistake)

خدا نے انسان کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر زندگی کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ اس ملاپ کا مستقل ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خدا نے نکاح کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ نکاح ایک مرد اور ایک عورت کو مستقل خاندانی تعلق میں جوڑتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر خود اپنے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور سماج کے تقاضوں کی بھی۔

مغربی زندگی میں آزادی کے غلط تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی کو بندھن خیال کیا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں جو آزادانہ زندگی پیدا ہوئی اس نے بے شمار خاندانی اور سماجی مسائل پیدا کر دئے۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جس سے گریٹا گاربو جیسی عورتیں دوچار ہوتی ہیں۔ جوانی کی عمر میں جب کہ ان کے اندر مردوں کے لئے کشش ہوتی ہے وہ ہر جگہ رونق محفل بنی رہتی ہیں۔ ان کو روزانہ ایسے تفریحی پروگرام ملتے رہتے ہیں جن میں مصروف رہ کر وہ اپنے صبح و شام گزارتی رہیں۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے اور وہ جنس مخالف کے لئے اپنی نسوانی کشش کھو دیتی ہیں تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی تمام سرگرمیاں محض مصنوعی سرگرمیاں تھیں۔ دوستیاں اور تعلقات اس طرح چھوٹ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کے پتے۔ اس وقت انھیں معلوم ہوتا ہے کہ مستقل وفاداری کو بندھن سمجھنا ان کی کتنی بڑی غلطی تھی۔

ان پر یہ کھلتا ہے کہ اب تک وہ خوابوں کی دنیا میں جی رہی تھیں۔ ان کی رونقوں سے بھری زندگی اچانک ایک سونے گھر میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ کتے اور بلی پال کر دل بہلاتی رہیں۔ ان کا کوئی رفیق حیات نہیں ہوتا جو خوشی اور غم میں ان کا شریک ہو۔ ان کے سامنے اپنے بچوں کا وہ "باغ" نہیں ہوتا جن کی صورت میں ایک آدمی اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے تسلسل کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہے۔ ان کے آس پاس کوئی "اپنا" نہیں ہوتا جس کو اپنی زندگی کا اثاثہ سونپ کر وہ سمجھیں کہ انھوں نے دنیا میں بے کار محنت نہیں کی۔ ان کو گوشت پوست کی کوئی ایسی دنیا نظر نہیں آتی جس کو وہ اپنا سمجھیں اور جو انھیں اپنا سمجھے۔ ایسے لوگ بھری ہوئی کائنات میں بالکل تنہا ہو کر رہ جاتے ہیں اور یقیناً کسی آدمی کے لئے تنہائی سے بڑی کوئی سزا نہیں۔

اچھی بیوی بنو

فرینک بورمن Frank Borman ایک امریکی خلاباز ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی خلائی کشتی میں پرواز کیا تھا جس میں ان کے علاوہ ایک خاتون خلاباز بھی سوار کرائی گئی تھی۔ مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا :

Having women on space-craft was okay except that it would be upsetting to put a male and a female too close together for a long time.

خلائی کشتی میں عورت کو بٹھانا اچھا ہے۔ البتہ ایک عورت اور ایک مرد کو دیر تک اتنا زیادہ قریب رکھنا ابتری کا باعث ہوگا۔

مسٹر بورمن کے اس بیان نے مساوات مرد وزن کے بہت سے علم برداروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا :

"مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں اور باپ اکٹھا نہ ہوئے ہوتے"

سائنسی تحقیقات نیز عملی زندگی کے حقائق نے مساوات مرد وزن کے قدیم تصور کو سخت جھٹکا پہنچایا ہے۔ ایک امریکی خاتون مسز مارگن Marabel Morgan دو بچوں کی ماں ہیں۔ انھوں نے حال ہی ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے : مکمل عورت (Total Woman)

اس کتاب میں انھوں نے اپنی امریکی بہنوں کو "خوش گوار ازدواجی زندگی" کے لئے یہ سادہ گر بتایا ہے :

Be nice to your husband. stop nagging him and understand his needs.

اپنے شوہر کی اچھی رفیق بنو۔ اس کو ملامت کرنا چھوڑ دو، اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔

یہ کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں تین ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ موصوفہ کے نزدیک مرد کی رفیق بننا عورت کی تکمیل ہے نہ کہ آزادانہ زندگی کا مالک بننا۔ (ٹائمس آف انڈیا۔ ۸ فروری ۱۹۷۸)

حقیقت یہ ہے کہ مکمل عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی مکمل رفیق بن سکے۔

ناکامی کا اعتراف

امریکہ کی ایک ایکٹرس جین سیبرگ (Jean Seberg) نے اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ امریکہ کے علاوہ یورپ میں بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس نے قدیم انداز میں ایک "گھر" بسانے کے بجائے لاکھوں گھروں کے لئے سامان تفریح بننے کو ترجیح دیا۔ مگر اس کی موت کے بعد جب اس کی ڈائری پڑھی گئی تو اپنی ڈائری کی آخری سطروں میں اس نے لکھا تھا۔

کاش میں اپنے گھر میں رہی ہوتی (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۱)

کیسا عجیب تھا یہ کامیاب سفر جو بالآخر صرف ناکامی پر ختم ہوا۔

خدا نے جس طرح اس دنیا کی مادی چیزوں کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی فطرت پر قائم رہ کر کوئی چیز اپنا صحیح وظیفہ انجام دے پاتی ہے۔ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ خدا نے مرد کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی طرح عورت کو بھی خاص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ دونوں اسی وقت اپنی زندگی صحیح طور پر گذار سکتے ہیں جبکہ وہ خدا کی فطرت پر قائم رہیں۔ فطرت سے ہٹتے ہی وہ زندگی کے نقشہ میں اپنا مقام کھو دیں گے۔

عورت کی صلاحیتیں واضح طور پر مرد سے مختلف ہیں۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کا دائرہ کار اور مرد کا دائرہ کار، عمومی اعتبار سے یکساں نہیں۔ مرد کا دائرہ کار اگر "باہر" ہے تو عورت کا دائرہ کار "اندر"۔ مرد اپنے دائرہ کار میں زیادہ مفید بن سکتا ہے اور عورت اپنے دائرہ کار میں۔ اگر دونوں اپنے دائرہ کار کو بدلیں تو دونوں اپنی معنویت کو کھو دیں گے۔ دونوں اپنے کو بے جگہ بنالیں گے۔

صرف مسائل پیدا ہوئے

امریکہ سے ایک ناول چھپا ہے جس کا نام ہے "اکیلی خاتون"

Harold Robbins. *The Lonely Lady* New English Library, London. 1976. pp. 448

اس ناول میں امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرہ کی ایک کمزوری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کی غیر شادی شدہ زندگی بالآخر ایک ناقابل برداشت تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی کے مطابق، ایک خوبصورت اور نوجوان امریکی خاتون فلمی دنیا کی چمک دمک (Glamour) سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ زندگی کو چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاتی ہے۔ اس کی باکمال نسوانیت اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ بہت جلد ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ترقی کے آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ دولت، شہرت، عزت اور چاہنے والوں کی بھیڑ، ہر چیز بافراط اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ مگر ترقی کی آخری انتہا پر پہنچنا اس کو سکون نہیں دیتا۔ اب وہ ایک تلخ حقیقت (Bitter Truth) کو دریافت کرتی ہے:

That fame has a way of fading, and friends a way of disappearing when they are most needed.

یہ کہ شہرت بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوست بالآخر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ایک عورت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے یہ امریکی خاتون نہایت حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے:

Only a woman knows what loneliness is

حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت ہی اس بات کو جانتی ہے کہ اکیلا پن کیا ہے۔ ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ فلمی دنیا کے ذریعہ بڑی بڑی کمائی کرنا اور اپنے لئے ایک خود مختار زندگی حاصل کرنا بظاہر بڑا پُرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب عورت کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھیوں میں اس کے لئے کشش باقی نہیں رہتی تو وہ ایک ناقابل برداشت حادثہ سے دوچار ہوتی ہے۔

اس کے پاس دولت اور مادی ساز و سامان کا انبار ہوتا ہے۔ مگر وہی چیز نہیں ہوتی جس کی ایک عورت کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی زندگی کا چین۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا جو اس کے صبح و شام میں اس کا ساتھی بن سکے۔ وہ ایک ایسے آباد گھر کی مالک نہیں ہوتی جس کو وہ اپنا گھر سمجھے:

Here is a loneliness born of independence, of honest individualism in a society where only dishonesty brings profit.

یہ ایک تنہائی ہے جو خود مختار زندگی سے برآمد ہوتی ہے، ایک دیانت دارانہ فردیت، ایک ایسے سماج میں جہاں بددیانتی ہی سب سے بڑا نفع بخش سرمایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بے حد نازک ترکیب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ تبدیلی بھی صرف بربادی پر ختم ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات کی دنیا کے لئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ فطرت کے بنائے ہوئے نظام سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہاں مطلوب نتیجہ تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ فطرت کے مقررہ ڈھانچہ کو قبول کیا جائے۔ مگر وہی انسان جو جمادات اور نباتات کے معاملہ میں اس حقیقت کی مکمل پابندی کرتا ہے وہ خود اپنی زندگی کے معاملہ میں اس ابدی حقیقت کو بھول جاتا ہے۔

عورت اور مرد کے لیے فطرت کا بنایا ہوا نظام یہ ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی گزاریں۔ ان کی جسمانی ساخت، ان کے نفسیاتی اور خاندانی مسائل، ان کے اجتماعی رشتے سب اپنی درستگی کے لیے شادی شدہ زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ عورت کا آزاد اور خود مختار ہونا، الفاظ کے اعتبار سے بظاہر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر اس

کا عملی تجربہ اتنا ہی زیادہ بھیانک ہے۔

عورت اپنی جوانی کی عمر میں بڑی آسانی سے اس قسم کے خوش کن اور دل فریب نظریات کا شکار ہو جاتی ہے۔ مگر جب اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا راستہ غلط تھا۔ مگر یہ علم اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ تلافی کا وقت نہیں ہوتا۔ اب اس کے لیے موجودہ دنیا میں جو چیز رہ جاتی ہے وہ صرف یہ کہ کتوں اور خرگوشوں کو پال کر مصنوعی طور پر ان سے دل بہلائے اور بالآخر حسرت اور مایوسی کے قبرستان میں جا کر سو رہے۔

لذتیت کا انجام

جان کینڈی (۱۹۶۳-۱۹۱۷) امریکہ کا ۳۵ واں صدر تھا۔ اس نے جیکولین کینڈی سے شادی کی۔ اس کے بعد جیکولین کینڈی امریکہ کی خاتونِ اول کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئی۔

امریکہ کی ایک خاتون مصنف کٹی کیلی نے جیکولین کینڈی کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے۔ آہ جیکی۔ (Jackie Oh) یہ کتاب جیکولین کینڈی کے نجی حالات کے بارے میں ہے جو کہ کسی وقت امریکہ کی خاتونِ اول (First Lady) تھی۔

جیکولین قدرت سے ایک پُرکشش نسوانی شخصیت لے کر پیدا ہوئی۔ اس کی اس پیدائشی خصوصیت نے جان کینڈی کو متاثر کیا جو امریکہ کی ایک اعلیٰ فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی شادی جان کینڈی سے ہو گئی۔ بعد کو جان کینڈی امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح جیکولین کینڈی کو امریکہ میں وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل ہو گیا جس کے آگے مزید برتری کا کوئی مقام نہیں۔

جان کینڈی ۱۹۶۰ میں امریکہ کے ۳۵ ویں صدر منتخب ہوئے تھے۔ مگر اس کے صرف تیسرے سال ۲۳ نومبر ۱۹۶۳ کو صدر کینڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جیکولین کینڈی جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معزز خاتون بن چکی تھی اچانک بے حیثیت ہو کر رہ گئی۔ تاہم اس کی نسوانی کشش نے یونانی ارب پتی ارسٹاٹل اوناسس (۱۹۷۵-۱۹۰۶) کو متاثر کیا۔ اس کی دوسری شادی اوناسس سے ہو گئی۔ اس وقت جیکولین کی عمر تقریباً ۴۰ سال اور اوناسس کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔ یہ شادی دونوں کے لیے خوش گوار ثابت نہ ہو سکی۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی دونوں الگ الگ رہنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۵ میں طویل بیماری کے بعد اوناسس کا انتقال ہو گیا، جب کہ

جیکولین اس کے پاس موجود بھی نہ تھی۔

جیکولین کو ہر چیز ملی مگر اس کو خوشی نہ مل سکی۔ اس کی سوانح نگار کٹی کیلی کے الفاظ میں جیکولین نے خوشی حاصل کرنے کی بابت اپنی ناقابل علاج خواہش کو خرید کر حاصل کرنا چاہا۔ خواہ اس کی قیمت ۳ ہزار ڈالر فی گھنٹہ دینی پڑے۔ اس کے باوجود وہ خوشی حاصل نہ کر سکی:

---- an incurable desire to buy happiness, even if it meant spending as much in one hour as 3000 dollars.
Jackie Oh: *An Intimate Biography*,
By Kitty Kelley, Vikas, New Delhi, 1979, pp. 336

خودکشی کر لی

میریلین مونرو (Marilyn Monroe) امریکہ کی ایک انتہائی مشہور خاتون ہے۔ اس نے اولاً فوٹو گرافر کے ماڈل کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی غیر معمولی نسوانی کشش کی بنا پر فلم کی دنیا کی ہیرو بن گئی۔ اس کو جنسی دیوی (Sex goddess) کہا جانے لگا۔ اس کی فلموں کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں کہیں اس کا کوئی "شو" ہوتا تو بے شمار تماشائی اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔

میریلین مونرو کا آخری فلم بے جوڑ (The Misfits) تھا۔ فلم کا یہ عنوان گویا خود اس کی اپنی زندگی کا بھی عنوان تھا۔ وہ اپنے کو بے جگہ پا رہی تھی۔ انسانی سمندر کے درمیان وہ نفسیاتی طور پر تنہا ہو کر رہ گئی تھی۔ بظاہر اس کی ہنستی ہوئی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ مگر اندر سے وہ اپنے آپ کو مستقل طور پر افسردگی (Depression) میں محسوس کرتی تھی۔ آخر کار وہ اس نفسیاتی عذاب کو برداشت نہ کر سکی۔ ۵ اگست ۱۹۶۲ کو اس نے بیک وقت بہت سی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف ۳۶ سال تھی۔

اس قسم کی عورتوں کا عام حال یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر خوش دکھائی دیتی ہیں مگر ان کا دل مستقل طور پر روتا ہے۔ ان کی زندگی بڑی مظلومی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ سب کی ہوتی ہیں مگر کوئی ان کا نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو خوش کرتی ہیں مگر ان کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کوئی نہیں جس کے ساتھ وہ اپنی خوشی کے لمحات گزار سکیں۔ مجلسی تقریبات میں بظاہر ان کی شخصیت ایک معمور شخصیت

دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقی دنیا میں وہ اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کرتی ہیں۔ ابتدائی شاندار زندگی آخر کار ایک غیر شاندار زندگی پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تنہائی کی زندگی عورت کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ عورت تنہائی کا تحمل نہیں کر سکتی۔ مگر مغربی تہذیب کا راستہ عورت کو آخر کار جہاں پہونچاتا ہے وہ یہی تنہائی کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس اسلام عورت کو ایک ایسی زندگی کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ تنہا نہیں ہوتی، بلکہ ایک پورے خاندان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام کا طریقہ فطری طریقہ ہے اور مغربی تہذیب کا طریقہ غیر فطری طریقہ۔

مجھ سے دور رہو

انڈین اکسپریس (۱۴ مئی ۱۹۸۶) میں صفحہ ۱۴ پر ایک مغربی عورت کی تصویر ہے۔ وہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے اور ایسی پریشان حال دکھائی دے رہی ہے جیسے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ مگر یہ کوئی عام عورت نہیں۔ یہ دور جدید کی مشہور ترین ایکٹرس ایلزبتھ ٹیلر ہے۔ تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

ASKING FOR MONEY: Testifying before a Senate sub-committee Capitol Hill in Washington on Thursday actress Elizabeth Taylor pleads for more money to find a cure for the deadly AIDS disease.

Indian Express (New Delhi) May 14, 1986

"ایدز" کے لیے رقم۔ امریکی سینٹ کی ایک سب کمیٹی کے سامنے واشنگٹن میں ایکٹرس الزبتھ ٹیلر اپنا مسئلہ پیش کرتے ہوئے مزید رقم کا مطالبہ کر رہی ہے تاکہ وہ ایدز کے مہلک مرض سے نجات حاصل کر سکے۔

"ایدز" موجودہ زمانہ کا ناقابل علاج مرض ہے جو بے قید جنسی اختلاط کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ اس مرض میں مبتلا شخص نہ صرف خود عجیب و غریب قسم کی تکلیفوں کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ وہ متعدی بھی ہے۔ دوسرے لوگ ایسے شخص سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا ہے کہ ایدز کے مریض سے جو شخص چھو جائے گا اس کو بھی ایدز کا مرض لاحق ہو جائے گا۔ چنانچہ ٹیلر جیسی خواتین جن سے قریب ہو کر لوگ فخر محسوس کرتے تھے، اب وہ ایسی عورتوں سے دور بھاگ رہے ہیں

کہ کہیں ان کو بھی یہ مہلک مرض لاحق نہ ہو جائے۔

کیسا عجیب ہے مغربی عورت کا یہ انجام۔ وہ مساوی درجہ حاصل کرنے کی کوشش میں غیر مساوی درجہ تک پہونچ گئی۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ انسانی قافلہ سے پیچھے چلی گئی۔

شہرت بوجھ بن گئی

فرانس کی سینما کی تاریخ میں جس خاتون نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ "بی بی" (Brigitte Bardot) ہے۔ وہ ۱۹۳۴ میں پیدا ہوئی۔ فلمی دنیا میں بعض اعتبار سے اس نے میریلین مونرو اور مارلین ڈٹرچ سے بھی زیادہ بڑا مقام حاصل کیا۔ جون آف آرک کے بعد وہ فرانس کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ خاتون شمار ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "بی بی" کے ذریعہ باہر کی جو دولت فرانس میں آئی وہ اس سے بھی زیادہ ہے جو مشہور رینالٹ (Renault) موٹر کمپنی کے ذریعہ فرانس میں آئی۔ ٹوٹی کرالی نے ۱۹۵۸ کے آخر میں اندازہ لگایا تھا کہ اس کی تصویریں یورپ اور امریکہ کے جرائد کے صفحہ اول پر ۲۹۴۵ بار چھپ چکی ہیں۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۸۶)

"بی بی" کی فلم پر فلم بنتی رہی۔ اس کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ بعض اوقات وہ اپنے گھر سے نکلنے میں صرف اس لیے کامیاب نہ ہو سکی کہ اس کے گھر کے باہر فوٹو گرافروں کی ناقابل عبور فوج کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے نام روزانہ اتنے زیادہ خطوط آتے تھے کہ ان کی منتخب تعداد کو پڑھنا بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔

ان تمام ظاہری رونقوں کے باوجود اندر سے وہ سخت غیر مطمئن تھی حتی کہ اس کی شہرت اس کے لیے ایک بوجھ بن گئی۔ اس نے خودکشی کے ارادہ سے ایک رات بہت زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں:

Worn out by her own fame, one night Brigitte swallowed an overdose of tranquillizers.

تاہم وہ مر نہ سکی۔ اس وقت بھی جب کہ وہ نازک حالت میں پیرس کے ایک اسپتال میں لے جائی جا رہی تھی، فوٹو گرافروں نے ایمبولنس کار کو زبردستی راستہ میں روکا تاکہ وہ اس کا

فوٹو لے سکیں۔ "بی بی" کے بارہ میں ایک رپورٹ میں اس کا تاثر بتایا گیا تھا کہ کیمرہ کے سامنے اس نے کبھی سکون محسوس نہیں کیا:

She never really felt at ease in front of the camera.

۳۹ سال کی عمر میں جب کہ وہ تقریباً پچاس کامیاب فلمیں بنا چکی تھی، اس نے اچانک اپنا کیریر ختم کر دیا۔ وہ فلمی دنیا سے بالکل بے تعلق ہو گئی۔ اس نے اپنی شاندار رولس رائس کار فروخت کر دی اور اپنے مکان میں تنہا رہنے لگی جہاں وہ ایک معمولی انسان کی طرح خاموش زندگی گزار سکے:

She sold her Rolls-Royce and went to live alone in her house on the Riviera, "to cease to be considered a beautiful object and become a human being like any other." she said.

حقیقت یہ ہے کہ گھر کے باہر کی دنیا میں ہیرو بننا اور ہر طرف شہرت حاصل کرنا عورت کی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ عورت فطری طور پر حیا پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنوعی میدانوں میں شہرت پانے والی عورتیں اپنے کیریر کے درمیان میں یا اس کے آخر میں خانہ نشین ہو جاتی ہیں۔ وقتی چمک دمک کے بعد بالآخر ان کو جہاں سکون ملتا ہے وہ ان کا گھر ہے نہ کہ ان کا باہر۔

عورت کے بارہ میں اسلام کا قانون عورت کی اسی فطرت کی رعایت ہے نہ کہ عورت کے اوپر کوئی ظلم۔ وہ مقام جہاں ایک عورت ناکام تجربہ کے بعد پہونچتی ہے، اسلام چاہتا ہے کہ وہ اپنے آزاد ارادہ کے تحت خود اپنے انتخاب کے ذریعہ وہاں پہونچے۔

میدان عمل سے محرومی

مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے قیمت پاتا ہے۔ عورت کو مرد کے مساوی قرار دے کر جب گھر سے باہر لایا گیا تو اس کی قیمت اس میں تھی کہ وہ ان تمام شعبوں کو سنبھال لے جن کو مرد روایتی طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ یعنی وہ پائلٹ، ڈرائیور، انجینیر، پروفیسر، ایڈمنسٹریٹر، پولیس آفیسر، فوجی کمانڈر وغیرہ وغیرہ تمام حیثیتوں میں بالکل مرد کی طرح کام کرنے لگے۔ مگر حیاتیاتی اعتبار سے عورت کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ ان شعبوں کو اس طرح سنبھال نہیں سکتی جس طرح مرد ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔

عورت جب مردانہ شعبوں کو سنبھال نہ سکی تو اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ وہ ان شعبوں میں جمع ہونے لگی جن میں وہ اپنی نسوانیت کے اعتبار سے قیمت پا سکتی تھی نہ کہ تمدنی کارکردگی کے اعتبار سے۔ مثلاً فلم، ٹیلی ویژن، تفریحی مجلس، وہ اشتہاری صنعتیں جو عورت کی نسوانیت کو استعمال کرتی ہیں۔ مگر یہاں عورت کی دوسری کمزوری اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ان شعبوں میں جوان عورت کی قیمت تھی اور عورت کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ جوان رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت باہر نکل کر ایک قسم کی ادھوری شخصیت بن گئی۔ وہ صرف جوانی کے چند سالوں تک اپنے کو باقیمت ثابت کر سکی۔ جوانی کی مدت ختم ہونے کے بعد باہر کی زندگی میں اس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

مغربی ملکوں میں آزادیٔ نسواں کی تحریک نے پردہ کو ختم کر دیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان کوئی حد بندی باقی نہ رہی۔ تمام عورتیں سڑکوں اور بازاروں میں نکل آئیں۔ اب جن عورتوں میں نسوانی کشش نسبتاً زیادہ ہو وہ فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ مگر یہ مقبولیت اس قیمت پر حاصل ہوتی ہے کہ وہ خاندانی زندگی سے دور ہو جاتی ہے۔ وہ شادی کو بندھن سمجھ کر اس سے بے رغبت ہو جاتی ہیں۔ وہ گھر بنا کر اس میں رہنے کے بجائے محفل کی رونق بننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

مگر یہ پُر رونق لمحات بے حد وقتی ہوتے ہیں۔ جوانی کی خاص عمر تک ان عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھیں نارنگی کے چھلکے کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ مقبول شخصیت بالآخر خود اپنے ماحول میں غیر مقبول شخصیت بن کر رہ جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں صرف "جوان عورت" کے لیے جگہ ہے۔ "بوڑھی عورت" کے لیے مغربی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں ایک عورت اپنی نسوانی کشش کی بنیاد پر جگہ حاصل کرتی ہے۔ بڑھاپے میں یہ نسوانی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے مغربی عورت بوڑھی ہونے کے بعد اپنا مقام بھی کھو دیتی ہے۔ "جو شخص ذمہ داری قبول نہ کرے اس کو حقوق میں بھی حصہ نہیں ملتا" یہ مقولہ اپنی بدترین شکل میں مغربی عورت کے حق میں صادق آیا ہے۔

خاندان سے وابستہ ہو کر جو زندگی بنتی ہے۔ اس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خاندان میں ایک عورت "بیوی" کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کرتی ہے۔ یہاں اس کو اپنے عمل کا بھرپور میدان

مل جاتا ہے۔ اس کا گھر ایک پوری مملکت ہوتا ہے جس کو وہ سنبھالتی ہے اور جس کی وہ تنہا انچارج ہوتی ہے۔ یہاں اس کی کارکردگی سے اس کی تاریخ بنتی ہے جو آخر وقت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہر اگلا دن یہاں اس کے عزت و احترام میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ "ماں" بنتی ہے۔ پھر وہ نانی اور دادی بنتی ہے۔ حتی کہ خود اپنے شوہر کی نظر میں اس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ عورت جوانی کی عمر میں بیوی ہوتی ہے اور بڑھاپے کی عمر میں ماں بن جاتی ہے۔

اس طرح عمر بڑھنے کے ساتھ گھر کے اندر اس کا وقار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھر کی مالکہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ خاندان کسی عورت کی وہ دنیا ہے جو اول سے آخر تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جب کہ مغربی تہذیب کا حال یہ ہے کہ وہ زندگی کے چند سالوں میں عورت کی ساتھی ہے، وہ اس کی عمر کے طویل تر حصہ میں عورت کی ساتھی نہیں۔ مغربی زندگی میں عورت اپنی جوانی کے چند سال کے بقدر قیمت پاتی ہے اور خاندانی زندگی میں اپنی پوری عمر تک۔

جاپان کی مثال

جاپان کی عورتوں کے بارہ میں ایک رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان میں اگرچہ ۱۵ ملین کارکن خواتین موجود ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر معمولی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے مرد افسروں (Male superiors) کی مددگار کے طور پر کام کرتی ہیں۔

۳۶ سال کے بعد دو خواتین جاپانی کابینہ میں لی گئی ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر متحدہ اقوام کے موسم خواتین کی رعایت سے جو ۱۹۸۵ میں ختم ہو رہا ہے۔ جاپان میں اس وقت ۶۰۸ ڈپلومیٹ ہیں۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔ جاپان آج بھی بنیادی طور پر مردوں کا سماج (Male-dominated society) ہے۔

رپورٹ میں جاپان کی موجودہ خاتون وزیر کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:

A bill, yet to be passed by the parliament, on ending discrimination against women, is considered by many of its male critics as reverse discriminatory.

عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کرنے والا ایک بل جاپانی پارلیمنٹ میں ہے مگر وہ اب تک پاس نہ ہو سکا۔ اکثر مرد ناقدین اس بل کو برعکس امتیاز پیدا کرنے والا اقدام سمجھتے ہیں (انڈین اکسپریس ۲۴ نومبر ۱۹۸۴)

جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی مساوی شرکت کے بغیر قومی ترقی نہیں ہو سکتی انھیں اس واقعہ سے نصیحت

لینا چاہیئے۔ جاپان دورِ جدید کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر یہ ترقی اس کو اس کے بغیر حاصل ہوئی ہے کہ اس نے اپنی خارجی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں عورتوں کو برابر کے شریک کی حیثیت سے داخل کر دیا ہو۔

قدیم زمانہ میں عورت اور مرد کے کام کا دائرہ الگ الگ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس حد بندی کو ختم کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ تقسیم عمل کے قدیم نظام کو توڑنے کا کوئی فائدہ تمدنی ترقی کے اعتبار سے نہیں ہوا۔ جن ملکوں میں عورت اور مرد دونوں کو زندگی کے ہر میدان میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے وہاں بھی عملاً زندگی کے تمام ترقیاتی کام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ عورتوں کے ہاتھ میں۔

جاپان کی مذکورہ مثال بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ جاپان پورے معنوں میں دورِ جدید کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر وہاں کا سماج ابھی تک قدیم انداز کے مطابق مردوں کے غلبہ کا سماج ہے۔ جاپان کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ترقی کے لئے عورتوں کی مفروضہ مساوی شرکت ضروری نہیں۔

تذکیر القرآن ۔ جلد دوم

تذکیر القرآن کی دوسری جلد اللہ کے فضل سے تیار ہو گئی ہے

اور اب طباعت کے مرحلہ میں ہے۔ دوسری جلد سورہ الکہف

سے سورہ الناس تک ہے اور اس کے صفحات ۹۰۰ سے کچھ زائد ہیں۔

قیمت کا اعلان آئندہ کیا جائے گا

شبلی اور علی گڑھ

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ـ ۱۸۵۷) کا تعلق علی گڑھ سے ۱۸۸۳ء میں قائم ہوا۔ اور سولہ برس تک جاری رہا۔ شبلی کا تعلق جس خاندان سے تھا، وہ سرسیّد کی تعلیمی تحریک سے بہت متاثر تھا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی تھے۔ اور اپنے لڑکے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل کرایا تھا۔

۱۸۸۳ء میں کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت ہوئی۔ مولانا شبلی نے اس جگہ کے لئے درخواست بھیجی جو سرسید اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ مولانا کو ایف اے اور بی اے کی کلاسوں کو عربی اور فارسی پڑھانے کا کام سپرد ہوا۔

مولانا کا تقرر اس وقت چالیس روپے ماہوار پر ہوا تھا۔ شروع زمانہ کا واقعہ ہے، کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں۔ اس ترتیب میں مولانا شبلی کی کرسی سب سے پیچھے تھی۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر مولانا شبلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر صلاحیت ایسی چیز ہے جو اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ چنانچہ جلد ہی بعد ایسا ہوا کہ نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھ گئی، بلکہ اپنے علم و فضل کی بدولت انھوں نے کالج کی بزم میں صدر نشینی کی حیثیت حاصل کر لی۔

سب سے پہلے تو ان کی وہ مرعوبیت ختم ہوئی جو اس زمانے میں ایک مولوی کو عام طور پر انگریزی دانوں سے ہوتی تھی۔ علی گڑھ جانے کے چند ہی مہینے بعد ایک عزیز کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانے میں بی، اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے ـــــ لاحول ولا ..... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔

(حیات شبلی (۱۹۴۳) ۱۳۱)

اس کے بعد کالج کی دنیا میں شبلی کو جو مقام ملا، اس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان، ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے۔ ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریانشیں عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تہذیب و تمدن کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکایک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا۔۔۔۔ مولانا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھائے رہتے تھے اور ہر علمی بحث میں ان کا قول فیصل تھا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا اور قدیم علوم و فنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا۔ ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل، اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔" (حیات شبلی — ۱۴۸)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی نے علی گڑھ میں قیام کر کے ایک عظیم سبق دیا ہے۔ یہ سبق کہ عزت اور مقام حاصل کرنے کا راز صرف تنخواہ اور ڈگریاں نہیں ہیں۔ ایک خالص مولوی آدمی بھی ایک بالکل ماڈرن ماحول میں عزت اور مقام حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم اور قابلیت رکھتا ہو۔

شبلی کو علی گڑھ میں یہ مقام ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہوا۔ اس دور میں خیالات کو شعر کے پیراہن میں ظاہر کرنے کا خاص ذوق تھا۔ مولانا شبلی اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نہایت اعلیٰ مذاق کے اشعار لکھتے تھے اور نہایت موثر لہجے میں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ کالج کے ہر جلسہ اور تقریب میں مولانا کی نظم اس کے پروگرام کا ضروری جزو ہوتی تھی۔ اس وقت کے علی گڑھ میں شبلی کو شاعر کی حیثیت سے جو مقام حاصل تھا اس کا نقشہ ان کے دو شعروں میں بڑی اچھی طرح نظر آتا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں مولانا شبلی نے روم اور مصر و شام کا سفر کیا تھا۔ واپس آئے تو علی گڑھ میں بڑا شاندار استقبال ہوا۔ اس سلسلہ میں طلبا کی یونین نے بھی ۱۰ دسمبر

۱۸۹۲ء کو ایک بزم دعوت ترتیب دی۔ اس موقع پر مولانا نے اپنا ایک قصیدہ پڑھا جس کے دو شعر حسب ذیل تھے :

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد
کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید
یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد

اس زمانہ میں علی گڑھ کی تاریخ دیکھئے تو یہ الفاظ بالکل ایک واقعہ کا بیان معلوم ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے علی گڑھ کو اگر شیراز سے تشبیہ دی جائے تو شبلی اس شیراز کے بلبل تھے۔

اسی طرح تقریر کا ملکہ بھی مولانا شبلی میں غیر معمولی تھا۔ جس جلسہ میں تقریر کرتے پورے مجمع پر چھا جاتے۔ ۱۹۰۰ء میں رام پور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ یونیورسٹی نے فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کرنے کا اعلان کرکے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا تھا۔ فارسی پر یہ اعتراض تھا کہ "فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم و فنون کا ذخیرہ ہے" (۱۶۶) مولانا شبلی نے اس پر تقریر کی اور اس خوبی سے اعتراضات کو رد کیا کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر ایڈورڈ برن بھی اجلاس میں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ــــ "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ مولانا شبلی کی طرح پُر تاثیر تقریر کر سکوں"۔ (حیات شبلی ــ ۱۶۷)

نومبر ۱۸۹۴ میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گذشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا۔ مولانا نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے موافقت کا پہلو اختیار کیا۔ یہ تقریر اتنی موثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ سید محمود نے بھی ان کے حق میں رائے دی۔ (۱۶۰)

اسی طرح ایک بار یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی۔ جلسہ میں سرسید بھی موجود تھے۔ مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی (۱۶۱) یہ بات آج کچھ عجیب نہیں معلوم ہوگی لیکن اگر

یہ خیال کیا جائے کہ یہ واقعہ ۱۸۹۲ء میں پیش آیا تھا تو مولانا کی تقریری صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولانا شبلی کی یہی سب خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ علی گڑھ کی فضا پر چھا گئے۔

شبلی کا علی گڑھ جانا محض ایک معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ یہ جدید و قدیم کا اتصال تھا۔ شبلی گویا قدیم کے ایک قابل اعتماد نمائندے تھے اور علی گڑھ اپنے وقت میں جدید کی نمایاں ترین علامت تھا ـــــ اس اتحاد و اتصال سے دونوں کو زبردست فائدے ہوئے۔

شبلی کا علی گڑھ سے وابستہ ہونا سرسید کے لئے زبردست تقویت کا باعث بنا۔ سرسید نے کالج کے چندہ کے لئے ۱۸۸۲ میں حیدرآباد کا پہلا سفر کیا تھا۔ یہ سفر ایک وفد کی شکل میں تھا جس میں تحریک کے بہت سے ممتاز لوگ شریک تھے۔ ان میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ وہ سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ (۱۸۳)

شبلی کی وجہ سے کالج کے حلقہ میں اعلیٰ ترین سطح پر علوم اسلامیہ کی نمائندگی ممکن ہو سکی۔ ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس موقع پر سرسید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہل علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی۔ مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کا عنوان اپنے لئے پسند کیا۔ جب یہ مضمون لکھنؤ کے اجلاس میں پڑھا گیا تو مسلمانوں کے سامنے اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں کا نقشہ پھر گیا اور سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں ـــ "لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اس پر دلگداز انداز میں ریویو ہوا ہے تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔" (۱۷۲)

اس زمانہ میں یورپ کی اس "علمی تحقیق" کا غلغلہ تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں انھوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموس کے زمانہ سے قائم تھا جلا کر خاک کر دیا۔ اور دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہو گئی۔

یہ منجملہ ان واقعات میں سے تھا جس کی وجہ سے مسلمان اپنے کو احساس کمتری میں مبتلا پاتے تھے۔ مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ میں اس کی تردید میں کتب خانہ اسکندریہ پر ایک مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کی فتح مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا۔

مولانا نے بتایا کہ یہ کتب خانہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں برباد کیا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری کے ایک عیسائی مورخ ابوالفرج ملطی نے عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے اس واقعہ کو غلط طور پر مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا مولانا کی یہ تحقیق مقبول ہوئی اور بعد کو خود یورپین محققین نے اس کی تائید کی۔ (۲۲۰)

اسی طرح مثال کے طور پر مسلم سلطنتوں کے خلاف ایک نفرت انگیز پروپیگنڈا وہ تھا جو جزیہ کے نام پر کیا جا رہا تھا۔ یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے۔ اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا۔ گویا کوئی غیر مسلم اس مذہبی ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ مولانا شبلی نے اس سلسلہ میں رسالہ الجزیہ لکھا جس میں تحقیق سے ثابت کیا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے۔ یعنی اسلامی ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا۔

یہ تحقیق اس وقت ایسی عجیب تھی کہ علمی دنیا پر حیرت چھا گئی۔ سرسید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور خود مولانا سے اس کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا۔ بیرونی ملکوں میں بھی اس کے خلاصے اور اقتباسات شائع ہوئے۔ (۲۲۷)

مولانا شبلی کی اس طرح کی تحقیقات سے علی گڑھ میں اسلام کی علمی بلندی کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ سرسید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے جواب اور تصحیح کے لئے ایک مجلس بنائی جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں اس کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ مولانا شبلی کے مضامین اس سلسلہ میں داخل کئے گئے اور انھیں اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا۔ ان کے مضامین کے ترجمے عربی اور انگریزی میں بھی شائع کئے گئے۔ (۱۶۱)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا اس اجلاس میں بڑے بڑے باکمال جمع تھے مولانا شبلی نے تجویز پیش کی:

"اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کئے تھے ان پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کئے۔"

سرسید نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت ضرورت ہے۔ تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں۔ مگر بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون۔ ہمارے ہاں ایک مثل ہے "جو بولے وہی گھی کو جاوے" پس مولوی شبلی ہی اس کو لکھیں گے۔

" تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔ مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔" رودادِ کانفرنس الٰہ آباد ص ۹۱ بحوالہ حیاتِ شبلی۔ ۱۶۵

"محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" نے ۱۸۹۴ء میں ایک علمی رسالہ کی شکل اختیار کی تو اس کے اردو حصے کی ایڈیٹری مولانا شبلی کے سپرد کی گئی۔

بحیثیت استاد مولانا کے سپرد جو مضامین تھے ان میں بھی مولانا نے اپنی قابلیت کا سکہ جما دیا تھا مسعود علی صاحب محوی جو حیدر آباد دکن میں جج تھے اور اس کے بعد دارالترجمہ کے رکن مقرر ہوئے۔ مولانا کے زمانہ میں علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ وہ اپنے مجموعہ کلام کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کالج کے بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے۔ مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے۔ مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ (۱۸۲)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے ہیں:

" مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انھیں صحبتوں کے اثر سے۔ تاریخ و ادب فارسی کا ذوق یہیں نشو ونما پذیر ہوا ہے۔" (۱۵۲)

مقررہ درس کے علاوہ بھی طلبہ کے لئے کچھ کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کا شوق دلانے کے لئے انھوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح اخوان الصفا کے نام سے ایک انجمن قائم کی جو اردو تحریر و تقریر کی مشق کے لیے تھی۔ دونوں انجمنوں میں طلبہ دلچسپی سے حصہ لیتے تھے۔ (۶۰-۱۵۹)

۱۸۹۲ میں مولانا شبلی نے ترکی اور مصر و شام کا ایک علمی سفر کیا۔ یہ سفر بھی علی گڑھ کالج کی شان بڑھانے کا سبب بنا۔ کیوں کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت ــــــ "کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا۔" (۲۱۸) چنانچہ واپسی کے بعد مولانا کے اعزاز میں مختلف تقریبات

اور جلسے کئے گئے۔

اس سفر میں حکومت ترکی نے آپ کو "تمغہ مجیدی" عطا کیا جو ترکی کا ایک اعلیٰ اعزاز تھا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۹۴ء میں حکومت برطانیہ نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عنایت کیا۔ یہ اس زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص واقعہ تھا۔ نیز یہ پہلا واقعہ تھا جب کہ کالج کے کسی استاد کو علمی خطاب سے نوازا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد کالج میں متعدد جلسے ہوئے اور سرسید اور تمام لوگوں نے زبردست خراج عقیدت مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ (۲۳۸)

مولانا شبلی کی وجہ سے کالج کو جو علمی وقار اور مادی فائدہ حاصل ہوا، اس کا اعتراف سرسید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں۔ اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا۔ بایں ہمہ انھوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا بلکہ بالکلیہ مدرسۃ العلوم کو دیدیا۔" (۲۳۴-۲۳۳)

اس زمانہ میں مولانا شبلی کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین ماہ میں ایک ایڈیشن ختم ہو جاتا تھا۔ مگر مولانا نے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں اپنی تصنیفات سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا اور تمام کتابیں کالج کی نذر کردیں (۱۵۸-۵۹)

اس کے علاوہ بعض ریاستوں سے کالج کو امداد دلنے میں مولانا کی ذات معاون بنی۔

علی گڑھ کی تاریخ میں دینی رنگ پیدا کرنے والے سب سے پہلے مولانا شبلی تھے۔ مولانا شبلی دینی اعتبار سے علی گڑھ کو کیا سبق دینا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا۔ ۱۸۹۲ء میں جب وہ ترکی گئے تو وہاں انھیں ایک کالج (مکتبہ ملکیہ) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے اسی دوران میں ظہر کا وقت آگیا۔ اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ اس واقعہ کا والہانہ انداز میں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزل ہزار درجہ بہتر ہے۔" (۲۰۲)

اسی طرح مولانا نے ایک تقریر میں فرمایا:

"دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں۔ (۲۹۰)

محمد علی کے اندر اسلام اور قرآن کا ذوق مولانا شبلی کے درسوں سے پیدا ہوا۔ محمد علی اس وقت علی گڑھ کے ایک طالب علم تھے اور اس کا اعتراف انھوں نے اپنی کتاب (My Life: A Fragment) میں کیا ہے یہ مولانا شبلی کی بیدار مغزی کا اہم ثبوت ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ مذہبی طبقہ عام طور پر انگریزی تعلیم کی صرف مخالفت کرنا جانتا تھا انھوں نے اس واقعہ کو محسوس کیا کہ اصل کام لوگوں کو انگریزی تعلیم سے روکنا نہیں بلکہ ان کے اندر اسلامی ذہن پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ جدید تعلیم کو صحیح طور پر اپنے اندر جذب کر سکیں اس سلسلہ میں انھوں نے علی گڑھ کے سولہ سالہ قیام میں جو کوششیں کیں ان میں سے ایک درس قرآن کا اہتمام بھی تھا۔ جس نے مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی بنایا۔ سجاد حیدر یلدرم کہا کرتے تھے کہ مولانا ایسے اچھوتے انداز سے قرآن پاک کا درس دیتے تھے کہ ہم اس کو سن کر وجد کرتے تھے۔

طلبہ میں سنت نبوی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدء الاسلام لکھا جو کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا۔ میلاد کی مجالس کو وعظ و تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔

مولانا شبلی اس طرح مختلف سطحوں پر طلبہ میں دینی رنگ پیدا کرنے کی جو مسلسل کوشش کر رہے تھے اس نے کیا نتیجہ دکھایا۔ اس کو خود مولانا کی زبان سے سنئے۔ ایک عزیز کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ۔ آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں۔ مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی اے سکریٹری ہے۔ اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے۔ الصلوٰۃ خیر من النوم پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش

ہے۔ بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز، سبحان اللہ! کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا جاتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے ..... سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے..... مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔" (۱۵۰)

کالج کے لئے ایک یونیفارم کا تصور سب سے پہلے مولانا شبلی ہی نے دیا تھا۔ قسطنطنیہ کے سفر سے اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی۔ ہر کالج کا ایک خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔ سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے۔"

مولانا حالی کے بیان کے مطابق سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا اور اسی کے مطابق کالج میں یونیفارم کا طریقہ رائج ہوا۔

اسی طرح قسطنطنیہ کے سفر نے طلبہ میں معاشرت کی یکسانی پر زور دیا۔ سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

"ہر کالج میں غریب طالب علموں کی متعدد تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے۔ طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے۔ اور غرباء کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے۔ بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا..... میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں، بالکل مٹا دی جائیں۔

اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں۔" (۲۰۲)

جس طرح شبلی نے علی گڑھ کو بہت کچھ دیا، اسی طرح خود شبلی کو بھی علی گڑھ سے بہت کچھ ملا۔ اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔

مولانا شبلی ایک خالصتہً قدیم طرز کے عالم تھے۔ چنانچہ تعلیم کے بعد ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے مشاغل میں دل چسپی لینا شروع کیا جو اس زمانہ میں ان کے جیسے لوگوں کا عام مذاق تھا۔ مثلاً خاص طرح کی منطقی بحثیں اور مناظرہ وغیرہ۔ مولانا کی کتاب اسکات المعتدی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاشی مسائل بھی مختلف سمتوں میں کھینچتے رہے۔ کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کا کام دیکھا (۹۶) علی گڑھ سے تعلق نے ایک طرف مولانا کو موقع دیا کہ وہ معاش کے لئے سوچنا چھوڑ دیں۔ دوسری طرف یہاں کے ماحول نے انھیں وقت کی علمی ضروریات کا احساس دلایا اور ان کی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر کام کی طرف موڑ دیا۔

مولانا شبلی نے جس زمانہ میں علی گڑھ میں قدم رکھا یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ مسلمانوں کے اوپر سیاسی غلبہ حاصل کر چکا تھا۔ اس غلبہ کو مزید ذہنی تقویت پہنچانے کے لئے یورپ کے اہل قلم یہ طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے علوم کو بگاڑ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ مسلمان اب تک اپنی تاریخ پر ناز کرتے چلے آرہے تھے۔ اس کے جواب کے لئے مغربی مصنفین نے یہ کیا کہ اسلام، سلاطین اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر پھیلانا شروع کیا تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل خود اپنی قوم سے نفرت کرنے لگے اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قویٰ ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں۔

علی گڑھ کی فضا میں مولانا شبلی کو وقت کے اس فتنہ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں نیز گفتگوؤں اور تقریروں میں ایسی اعلیٰ علمی سطح پر اس کا رد پیش کیا کہ مستشرقین کا سارا غبارہ پھٹ گیا۔ ان کا یہ جذبہ یہاں تک بڑھا کہ قدیم کتب اسلامیہ سے استفادہ کے لئے انہوں نے اسلامی ممالک کے سفر کئے تاکہ وہ کتابیں جو ابھی تک چھپ نہیں سکی ہیں ان کے قلمی نسخوں کو دیکھ کر اپنی تصنیفات کے لئے مواد حاصل کریں۔ حالانکہ یہ بھی زمانہ کی نیرنگی ہے کہ جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے سفر کی محنت اٹھائی تھی وہ بعد کو انھیں کے زمانہ میں خود مخالفین کے ہاتھوں چھپ کر عام ہوگئیں

اور اب ان کی پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو چھپ نہ چکی ہو۔

مولانا شبلی نے جو تحریری کام کیا ہے، اس کا مشترک خصوصی موضوع غالباً ان لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے ـــــ اسلامی تاریخ کی عظمت کو نمایاں کرنا۔ اسلامی مسائل کو علمی سطح پر مدلل کرنا، اسلام کی عظمت رفتہ کو یاد دلا کر مستقبل کا حوصلہ پیدا کرنا۔ اور یہ وہی چیزیں ہیں جن کا احساس انھیں علی گڑھ کے ماحول میں ہوا۔ کیونکہ وہیں یہ صدائیں زیادہ گونج رہی تھیں۔

علی گڑھ کے قیام سے شبلی کو دوسرا اہم فائدہ یہ ملا کہ انھیں جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مولانا شبلی نے ایک تقریر میں اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔

"جب میں ٹرکی سے واپس آیا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی۔ ایک رات کو ۱۲ بجے تار آیا۔ میں نے اس کو کھولا۔ دل میں دھڑکا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے۔ خدا جانے کیسا تار ہے۔ خیر میں دوڑا ہوا سرسید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا۔ انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو ٹرکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ حال ہم مولویوں کا ہے (۱۳۵)

علی گڑھ میں مولانا کو اندازہ ہوا کہ اسلام پر انگریزی زبان میں جو کتابیں آ رہی ہیں وہ نہایت غلط ہیں۔ اس سے انھیں خیال ہوا کہ علمائے دین کو انگریزی اور دوسری یورپین زبانیں جاننی چاہئیں۔ تاکہ وہ مغربی زبانوں میں اسلام کا صحیح لٹریچر فراہم کر سکیں۔ اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار ان سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کے لئے آپ انگریزی پڑھنا کیوں ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ فقیہہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام دے گی۔ فرمایا ـــــ "عجیب بات کہتے ہو۔ اگر آج ہمارے فقہاء انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے۔" (۱۳۵)

مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں غالباً مولانا شبلی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے۔ اس لئے من نکردم شما حذر کنید کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علماء ایسے ہوں جو دینی علم کے ساتھ وقت کی زبان بھی جانتے ہوں تاکہ وقت کے ذہنوں پر اسلام کا سکہ بٹھایا جا سکے۔

علی گڑھ میں عمومی طور پر مولانا شبلی کو جو کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک چیز خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہ شبلی اور آرنلڈ کے تعلقات ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ایک نہایت لائق انگریز عالم تھے۔ دونوں کے علمی ذوق نے ایک دوسرے کو بے حد قریب کر دیا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لکھتے ہیں:

"بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا.... پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف پریچنگ آف اسلام کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ زبان سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے۔ (۱۴۰)

علی گڑھ کے تعلق سے جدید تعلیمی ضرورت کا احساس جس کی طرف مولانا شروانی نے اشارہ کیا ہے وہ اس وقت اور زیادہ پختہ ہو گیا جب مولانا شبلی اسلامی ممالک کے سفر سے واپس آئے۔ یہ سفر آپ نے علی گڑھ کے زمانۂ ملازمت میں کیا تھا۔ اور راستہ میں پورٹ سعید تک آرنلڈ بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ اب مولانا کو پختہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے نئے نظام تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔

یہاں ہم مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ مستعار لیں گے:

"مولانا شبلی کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی۔ اور طریقہ تربیت اور درس گاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو۔ اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درس گاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اس کی جگہ نئے علوم کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر

رہیں اور نصاب میں متاخرین کے شروح و حواشی کے بدلے قدماء کی اصل کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں۔ درس گاہیں عالی شان، کمرے صاف ستھرے اور تربیت ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو۔ لیکن یہ چیز ان کو نہ قسطنطنیہ میں ملی، نہ شام میں اور نہ مصر میں۔ سفرنامہ میں لکھتے ہیں ــــ "اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی۔" (سفرنامہ روم و مصر و شام)

مولانا شبلی کے اس تجربہ اور مطالعہ نے انھیں ایک نئے تعلیمی تصور تک پہنچایا۔ یہ کہ ایسی درس گاہیں قائم کی جائیں جہاں جدید و قدیم دونوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ مولانا سید سلیمان ندوی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام و دستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس نے دارالعلوم کا یہ مرقع (مسودہ) جس کو سیاح روم و شام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے۔ اس کو نظر آئے گا کہ روم و شام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (۲۱۷)

علی گڑھ سے مولانا شبلی کا تعلق ۱۸۸۳ء میں قائم ہوا اور صدی کے آخر تک جاری رہا۔ اس مدت میں مولانا کا تجربہ اور مطالعہ ان پر واضح کر چکا تھا کہ قوم کی اصلاح و ترقی کے لئے کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف وہ خود ایسی علمی اور تاریخی کتابیں تصنیف کرنا چاہتے تھے جو قوم کے لئے ذہنی انقلاب کی بنیاد بن سکیں۔ دوسری طرف ان کے ذہن میں کم از کم دو ایسے اداروں کا نقشہ آچکا تھا جو اگلی نسل میں شبلی جیسے انسانوں کا تسلسل باقی رکھنے والا ہو۔ ایک ایسی درس گاہ جو جدید و قدیم کی تعلیم کا مرکز ہو۔ اور دوسرے ایک ایسا تصنیفی ادارہ جو اسلامی موضوعات کے لئے اعلیٰ درجہ کے اہل قلم تیار کرے۔ ان کے پہلے خواب کی تعبیر دارالعلوم ندوۃ العلماء تھا اور دوسرے کی تعبیر دارالمصنفین۔ یہ دونوں ادارے آج بھی قائم ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے شبلی کے مطلوب انسان تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مولانا شبلی اب جو کام کرنا چاہتے تھے اس میں کالج کی ملازمت ایک رکاوٹ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ درس و تدریس کی ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر مندرجہ بالا قسم کے کام پر لگ جائیں۔

خوش قسمتی سے حیدر آباد نے ان کے لئے یہ موقع فراہم کر دیا۔ مولوی سید علی بلگرامی اور نواب وقار الملک کی کوششوں سے ریاست نے ان کے لئے ایک مستقل وظیفہ جاری کر دیا تاکہ وہ یکسو ہو کر اپنے مشن کی تکمیل میں لگ جائیں۔ اس سلسلے میں حیدر آباد کی طرف سے جو فرمان جاری ہوا اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:

"مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ اب ان کی تمنا ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں۔ مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے۔"

اس تمہید کے بعد فرمان میں کہا گیا تھا کہ چونکہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضروری ہے اس لئے ان کے لئے وظیفہ جاری کرنے کی منظوری دی جاتی ہے۔ یہ وظیفہ ابتداءً سو روپے ماہوار تھا اور آخر میں بڑھا کر تین سو کر دیا گیا۔

شبلی نے علی گڑھ میں جو کام کیا اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک اور چیز کو شامل کیا جائے۔ اس کے بغیر یہ مطالعہ خالص علمی اعتبار سے ناقص رہے گا۔ اور وہ ہے وہ زمانہ جس میں شبلی کو کام کرنے کا موقع ملا۔

شبلی کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ہندستان اس سے بہت مختلف تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ اس وقت مسلم غلبہ کا تسلسل نوابوں اور زمینداروں کی سطح پر بدستور جاری تھا۔ اردو ملک کی زبان تھی، حتیٰ کہ اس وقت کے بیرونی حکمراں (انگریز) بھی عام طور پر اردو کو سمجھتے تھے۔ ماضی کے نتیجہ میں شعر و شاعری کی عظمت ابھی تک لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اسباب تھے جنھوں نے شبلی کو وہ اعلیٰ مواقع کار دیئے جن کی مثالیں ان کی زندگی میں ملتی ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اہم بات یہ تھی کہ قدیم روایات کے نتیجہ میں ابھی تک قدر دانی کا ماحول موجود تھا۔ ایک شخص کے اندر جوہر دیکھ کر وقت کے بڑے لوگ کھلے طور پر اس کا اعتراف کر سکتے تھے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو آج کل بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج شبلی جیسی شخصیتیں بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔

مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ شبلی کو علی گڑھ کا بہترین انتخاب کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شبلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے سولہ سال جو علی گڑھ میں گزرے وہ ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس طرح دونوں کو وہ چیز ملی جس کی دونوں میں سے ہر ایک کو ضرورت تھی۔ شبلی نے علی گڑھ کے اوپر اسلام کی تاریخی اور علمی عظمت قائم کی جس کا وہ اس وقت بے حد محتاج تھا۔ اسی طرح علی گڑھ نے شبلی کو جدید کا عرفان دیا جس کے نتیجہ میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان وہ اسلامی شخصیت ابھر سکی جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے "عہد جدید کا معلم اول" کا لقب دیا ہے۔ شبلی اور علی گڑھ کے دو مختلف دھاروں کا ملنا اس امتزاج کو وجود میں لاسکا جس نے اسلامی تاریخ پر اعلیٰ ترین کتابیں تخلیق کیں جس نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی، جو دارالمصنفین کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر جس نے قوم کی اگلی نسلوں کو وہ ہیجان اور شعور دیا جو آج بھی جدید پر قدیم کو غالب کرنے کی امنگ اپنے سینوں میں لئے ہوئے ہے۔ جو زمانہ کی وقتی قدروں پر اسلام کی دائمی قدروں کو بالا کرنے کے لئے بے چین ہے۔ جس طرح علی گڑھ زندہ ہے، اسی طرح شبلی بھی زندہ ہے اور دونوں پھر اسی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے جس طرح وہ ماضی میں باہم ملے تھے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور تاریخ کا فیصلہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے۔

نوٹ: "شبلی ڈے" کے موقع پر ۳ مارچ ۱۹۶۸ کو یونین ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔

الرسالہ کے حلقے الرسالہ کو پھیلانے کے لیے جو طریقے اختیار کر رہے ہیں ان میں سے ایک ہینڈ بلوں کی تقسیم ہے۔ ایک حلقہ کے شائع کردہ ہینڈ بل کا نمونہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

- اگر آپ کے پاس وقت کم ہے _____
- اور آپ مختصر وقت میں کسی تعمیری پرچہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں _____
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ حکمت و نصیحت سے بھرپور سبق آموز واقعات مسلسل آپ کے مطالعہ میں رہیں _____
- اگر آپ عصری اسلوب میں اسلام کو پڑھنا چاہتے ہیں _____
- اگر آپ الحاد و لادینیت کی رد میں سائنٹفک مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں _____
- اگر آپ ایک ایسے رسالہ کے متلاشی ہیں جس میں قیامت کی کڑک، حشر و نشر کی ہولناکیاں، جنت و جہنم کے مناظر، خدائے ذوالجلال کی تجلیاں سیرتِ رسولؐ کی جھلکیاں، صحابۂ کرامؓ کی بے مثال قربانیاں ہوں ___

تو آپ

ہر مقام پر دینی رسالوں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
مولانا وحید الدین خاں صاحب کا دینی و فکری و علمی ماہنامہ

الرسالہ (اردو، انگریزی)

کا مطالعہ کیجئے

مینار لائبریری، ایک مینار مسجد، رائچور (کرناٹک)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول بنجے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز

عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ	ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ	سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی	۲۵ ڈالر امریکی	۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

September 1986
Number 118

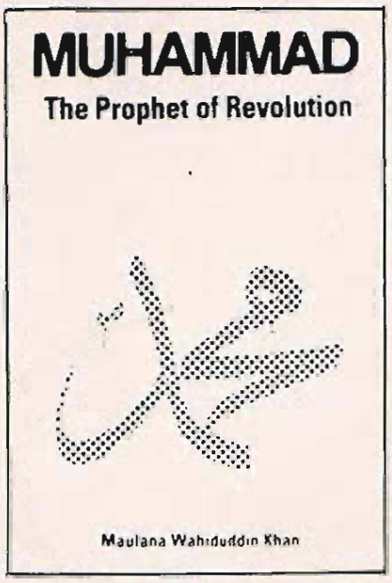

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013